قرآن و انسان

فلسفۂ توحید

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

مشمولات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

دیباچہ

اسلام نہ تو محض ضابطہ حیات ہے نہ آئیڈیالوجی (IDEOLOGY)، بلکہ یہ قرآنِ حکیم کے عقائدِ جلیلہ ومحرکہ کو اپنی زندگی میں جذب کر کے اس کے اوامر و نواہی کے مطابق حیاتِ طیبہ و صالحہ گزارنے کی آرزو وتحریک ہے۔ دین تحریک نہ رہے تو اس کے عقائد اپنے جمال وجلال اور زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں اور خود اس میں جمود و تعطل پیدا ہو جاتا ہے۔ اسے زندہ رکھنے، جمود و تعطل سے بچانے اور تحریک بنانے کے لیے تبلیغ، اجتہاد اور جہاد ناگزیر ہیں۔ یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ جمالیات کی زبان میں اسلام کو آرزوئے حُسن سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حسن سے مراد الحُسن، حسنِ زندگی اور حُسنُ المآب ہے۔

ان جمالیاتی اصطلاح کی فرداً فرداً صراحت کر دی جاتی ہے:

۱۔ الحُسن سے مراد اللہ تعالیٰ ہے، جس کی ذات جملہ صفاتِ حسنہ کا منبع اور وہ خود حُسنِ محض ہے اور حُسن سے محبت کرتا ہے، لہٰذا وہ انسان کا الٰہ یا معروضِ حُسن و عشق ہے۔ چونکہ وہ احسن الخالقین، ربّ ذوالجلال والاکرام ہے اور حُسن سے محبّت کرتا ہے، اس لیے اس نے اپنی ہر تخلیق کو حسین بنایا ہے۔ انسان اس کی جمالیاتی، تزدیجی تخلیقی فعلیت کا شہکار ہے، اس لیے اُسے جمالیاتی حِسّ AESTHETIC SENSE ودیعت کی ہے، جس کی بدولت وہ حُسن سے محبّت کرتا اور اس کی طلب و جستجو رکھتا ہے۔ لیکن جو شخص صاحبِ فطرتِ سلیم ہوتا ہے، وہ موحّد ہوتا ہے اور اس کا الٰہ یا معروضِ حُسن و عشق صرف اللہ تعالیٰ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ الظاہر بھی ہے اور الباطن بھی، اور ہر آن ایک نئی شان میں

اپنا جلوہ پیدا کرتا رہتا ہے، لہٰذا اس کی تلاش میں موحّد کو خوب سے خوب تر کی طلب و جستجو رہتی ہے۔ علاوہ ازیں، موحّد کو اس حقیقت کا حق الیقین ہوتا ہے کہ الحُسن ہی تنہا اس کا حقیقی اِلٰہ و ربّ ہے اور ہر حال میں وہ اپنے اس عقیدے پر ثابت قدم رہتا ہے، جس کے نتیجے وہ نفسِ مطمئنّہ، ولی اللہ اور صاحبِ جنّت ہوتا ہے۔

۲۔ حُسنِ زندگی کی آرزو کا مطلب یہ ہے کہ زندگی جمیل و جلیل، طیّب و مطمئن، منوّر و مطہر اور کشادہ و خوشحال ہو۔ جس انسان کی زندگی حسین ہے، اس کے لیے قرآنِ حکیم نے نفسِ مطمئنّہ، صاحبِ جنّت، ولی اللہ کی تعبیریں اختیار کی ہیں۔ جمالیات کی اصطلاح میں اُسے صاحبِ حُسن و سرور کہتے ہیں۔ حُسنِ زندگی میں دُنیوی و اُخروی حسنہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ حُسنِ زندگی کا سلبی مفہوم یہ ہے کہ زندگی خوف و حزن کے عذاب النّار سے محفوظ و مصئون ہو۔ چونکہ زندگی حُسنِ یقین و عمل سے حسین بنتی ہے، اس لیے حُسنِ زندگی میں توحید کے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ، اعمالِ صالحہ، حُسنِ اخلاق و کردار، حُسنِ سمع و بصر، قلبِ سلیم، حُسنِ نیّت، عقلِ نورانی اور طمانیتِ نفس کے معانی بھی پائے جاتے ہیں۔ نور بھی حُسن کا عنصر ہے، لہٰذا حُسنِ زندگی بھی ہے، جس سے انسان کی باطنی زندگی منوّر اور چشمِ قلب روشن ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک تو اس میں قوّتِ فرقان پیدا ہوتی ہے، دوسرے قوّتِ دید و نظر۔ قوّتِ فرقان کے ذریعے انسان توحید و شرک، حُسن و قبح، حق و باطل، حسنہ و سیّئہ، معروف و منکر اور خیر و شر میں تمیز کر سکتا ہے؛ دوسرے قوّتِ دید و نظر، جو ورائی مشاہدات اور دیدِ "دوست" کا ذریعہ ہے۔

زندگی کا خاصّہ حرکت و ارتقاء ہے، اور اس کے ارتقاء کا ذریعہ اس کا نورِ حُسن ہے، لہٰذا حُسنِ زندگی میں اس کے نورِ حُسن کے ارتقائے مدام کا مفہوم پایا جاتا

ہے اور اس اِرتقاء کے لیے ہم نے جمالیاتی اِرتقاء کی تعبیر اختیار کی ہے۔
جمالیاتی اِرتقاء کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کا ترفّعِ درجات اس کا مرہونِ منّت ہے، اور ترفّعِ درجات ہی سے انسان کو اپنے معروضِ حسن و عشق کی، جو ہر آن ایک نئی شان میں جلوہ افروز ہوتا رہتا ہے، دید و حضوری، ہم نظری و ہمکلامی اور قرب و رضوان کی نعمتِ عظمیٰ نصیب ہوتی ہے۔

۳۔ حُسنُ المآب قرآنِ مجید کی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب انسان کا حسین حقیقی گھر یعنی جنّت ہے، جسے اس نے "قُرّۃُ العین" یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک سے بھی تعبیر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنے گھر ہی میں جمالیاتی ٹھنڈک، تسکین و طمانیت، آرام و راحت اور محبت و مسرّت ملتی ہے۔ چونکہ جنّت میں حسنہ یعنی ہر وہ نعمت ہوگی، جو جمالیاتی حظ و سُرور کا سامان ہے اور ہر قسم کی سیّئہ یعنی احتیاج و فقر اور خوف و حزن کا فقدان ہوگا، اس لیے وہ انسان کے لیے حُسنُ المآب ہے۔ اس کی آرزو اس لیے بھی اہلِ توحید کو ہوتی ہے کہ وہ اُن کے اِلٰہِ جمیل کے قرب و حضوری، دید و رضوان اور ہم نظری و ہمکلامی کا حُسنُ المقام ہے۔

چونکہ اسلام آرزوئے حُسن ہے، اس لیے تحریکِ توحید ہے، اور آرزوئے حُسن میں اپنی زندگی اور دُنیا کے علاوہ اہلِ دُنیا کی زندگیوں اور ان کی دُنیا کو بھی حسین دیکھنے اور بنانے کی طلب و جستجو کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام تحریکِ رحمۃ للعالمینی ہے۔ حاصلِ کلام کی بنا پر اسلام کی یہ تعریف احسن و اکمل ہوگی کہ وہ تحریکِ توحید و رحمۃ للعالمینی ہے، جسے قرآنِ حکیم کی روشنی

میں حسنِ نیّت سے بیان کرنے کی مخلصانہ ذہنی کاوش اور خونابہ فشانیٔ چشم و جگر کا حاصل یہ تصنیف ہے۔ اس تصنیف کا محرّک اور غایتِ حقیقی بھی آرزوئے حسن ہی ہے۔

(ڈاکٹر) نصیر احمد ناصر
۱۴۔جی، گلبرگ ۳، لاہور، فون: ۸۸۱۷۳۵

فصل۔1

توحیدِ اُلوہیّت

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین اسلام ہے۔ اسلام نظامِ زندگی ہے جس کی روح رواں توحید ہے۔ توحید اصلِ ایمان اور اسلام کی بنیادی اصطلاح ہے، جس کی صراحت کر دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ واحد و احد ہے؛ یعنی وہ ایک، یکتا اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات، صفات اور کاروبارِ خدائی میں اس کا کوئی شریک نہیں اور نہ ہو ہی سکتا ہے۔ آذروں یعنی جعلی پیروں، مشائخ، سجادہ نشینوں، فقیروں، مجاوروں، ملنگوں اور علمائے سُو نے لوگوں سے نذرانے وصول کرنے، ان کا استحصال کرنے اور مسندِ ارشاد پر بیٹھنے کی خاطر یہ مشرکانہ بات مشہور کر رکھی ہے کہ ربّ عزیز و قدیر کی صفتِ ربوبیّت یا کاروبارِ خدائی میں بعض ائمہ و بزرگانِ دین شہدا، "اولیاء اللہ" شریک ہیں، اور وہ مرنے کے بعد سمیع و بصیر، عالم الغیب عزیز و قدیر اور مستجیب الدعوات بن گئے ہیں؛ نیز وہ خود ان کے پاس لوگوں کی درخواستیں پیش کرنے کی غیبی قوت رکھتے ہیں' اور اولیاء اللہ ان درخواستوں کا فیصلہ کرنے کی "خدائی" قدرت رکھتے ہیں۔ ایسے جھوٹے اور مشرکانہ عقیدے کے علمبردار و نقیب مذہبی پیشوا یقیناً جھوٹے اور مشرک ہیں! اور وہ خود بھی جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے اور منافق ہیں؛ لیکن حواس و عقل سے کام نہ لینے والے لوگ ان کی جھوٹی پیری و فقیری شہرت اور ریاکاری و جعلسازی سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور ان کی باتوں کو سچ مان کر ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں شرک کرنے لگتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ انسان کو حکم دیتا ہے: "اس کے پیچھے نہ لگ جس کا تجھے علم نہیں۔ یقیناً کان، آنکھ اور قلب یعنی دل و دماغ سے

متعلق سب (انسانوں) سے پوچھا جائے گا" (بنی اسرائیل ۱۷ : ۳۶)۔
قرآنِ مجید کی اس آیتِ جلیلہ میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ ربِّ رحیم نے جب انسانوں کو حواسِ خمسہ، خصوصاً کان، آنکھیں اور عقل و فکر ایسی منیر قوّتیں ودیعت کی ہیں تو ان سے کام لینا اس پر فرض ہے، ورنہ یہ کفرانِ نعمت ہوگا، جو گناہِ کبیرہ ہے اور اس کی سزا زوالِ نعمت ہے۔ اس میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنی قوّتوں سے کام لے سکتا اور ان کے ذریعے حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے؛ اس کے نتیجے میں وہ شرک سے بچ سکتا ہے جو ظُلمِ عظیم اور ناقابلِ عفو جرم ہے (لقمان ۳۱ : ۱۳؛ النسآء ۴ : ۱۱)۔
ہمیں یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ توحید اسلام کا زندہ و فعّال عقیدہ یا ایمان ہے۔ یہ بے جان و جامد نظریہ نہیں، بلکہ یہ جلیل و محکم عقیدہ ہے، لہٰذا یہ عمل چاہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عمل کے بغیر اس میں جمال و جلال اور قوّتِ حیات و قومیّت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ حقیقت ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ عقیدہ اس وقت ایمان بنتا ہے جب انسان کی فکری و عملی زندگی کا جزوِ لاینفک بن جائے اور وہ اپنے عقیدے کے مطابق زندگی کرے، ورنہ بصورتِ دیگر، وہ محض بے جان نظریہ بن کر رہ جاتا ہے۔
چنانچہ موحّد وہ انسان ہوتا ہے، جو عقیدۂ توحید پہ کامل ایمان رکھتا، اسے اپنی زندگی کا جزوِ لاینفک بناتا اور اس کے مطابق فکری و عملی اور انفرادی و اجتماعی زندگی بسر کرتا ہے؛ نیز شرک سے طبعاً نفرت کرتا اور اس سے ہر حال میں دُور رہتا ہے۔ جس طرح صدّیق طبعاً سچا ہوتا ہے؛ اسے حق و صداقت سے محبّت اور باطل و کذب سے نفرت ہوتی ہے؛ نیز اس میں فطرۃً سچائی کو قبول کرنے اور اس کی تصدیق کا داعیہ پایا جاتا ہے؛ اسی طرح موحّد بھی فطرۃً اللہ تعالیٰ کی واحدیّت واحدیّت اور سبحانیّت وصمدیّت کا قائل ہوتا ہے اور اسے شرک کی ہر صورت و شکل سے طبعاً نفرت ہوتی ہے؛ نیز اس میں توحید کی تصدیق اور شرک کی تکذیب کا داعیہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح صاحبِ ذوق شخص

دیکھتے اور جانتے بوجھتے مکھی نہیں کھاتا، اسی طرح سچا موحّد طبعاً اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اپنا اِلٰہ و ربّ سمجھتا نہ بناتا ہے۔

توحید کا لُبِ لباب یہ ہے کہ فقط اور تنہا اللہ تعالیٰ ہی بنی نوعِ انسان بلکہ جملہ مخلوقات کا اِلٰہ و ربّ ہے، لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور ہستی کو خواہ زندہ ہو یا مُردہ، اپنا اِلٰہ و ربّ مانتا اور بناتا ہے، وہ موحّد نہیں، مشرک ہے چونکہ شرک ظُلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی جرم ہے، اس لیے مُشرک ظالمِ اعظم اور ابدی جہنمی ہوا۔ اس اعتبار سے توحید کے دو اجزائے لاینفک یا اٹوٹ انگ ہیں اور وہ ہیں؛ اُلُوہیّت اور ربوبیّت؛ اور یہ دونوں قرآنِ حکیم کی بنیادی اصطلاحات اور نظامِ اسلام کی بنیادیں ہیں؛ لہٰذا ان کی صراحت کر دی جاتی ہے:

(۱) اُلُوہیّت یا توحیدِ اُلُوہیّت: اس کا مطلب ہے: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، یعنی نہیں کوئی اِلٰہ مگر اللہ۔ قرآنِ مجید کی رُو سے اِلٰہ کے معنی ہیں: معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود۔ یہ معانی ہم نے مندرجۂ ذیل آیاتِ جمیلہ سے اخذ کیے ہیں:

۱۔ اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَہٗ ھَوٰىہُ ط..... (الفرقان ۲۵: ۴۳-۴۴)؛ کیا تُو نے اس شخص کو دیکھا (یعنی اس کے کردار پہ غور کیا)، جو اپنی خواہش کو اپنا اِلٰہ یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود بناتا ہے؟ کیا تُو اُن کا ذمے دار ہو سکتا ہے؟ یا کیا تُو خیال کرتا ہے کہ ان میں اکثر سنتے یا عقل سے کام لیتے ہیں؟ وہ تو فقط چارپایوں جیسے ہیں، بلکہ وہ (اللہ تعالیٰ کے) راستے سے اور بھی دُور بھٹکے ہوئے ہیں۔

ان آیاتِ جمیلہ میں چار نکات خاص طور سے قابلِ غور ہیں: ایک یہ کہ انسان اپنی اس خواہش کو اپنا اِلٰہ بناتا ہے جس کا وہ دلدادہ و پرستار ہوتا ہے اور وہ اسے اس قدر محبوب ہوتی ہے کہ اس کی مطلوب و مقصود بن جاتی ہے۔ دوسرے، خواہش سے

مراد معروضِ خواہش (OBJECT OF DESIRE) ہے؛ یعنی وہ جاندار یا بے جان شے جس کی نفس کو خواہش ہو۔ تیسرے، ایسے پرستارِ خواہش کو اس کی گمراہی کے نتائج وعواقب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ چوتھے، ایسے مشرک وگمراہ لوگ بظاہر عاقل ودانشور لگتے ہیں، لیکن حقیقت میں ہوش وحواس سے کام لینے والے نہیں ہوتے۔ وہ تو چوپاؤں ایسے بلکہ ان سے بھی گئے گزرے اور راہ ومنزلِ مقصود سے دور اور بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔

۲۔ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ...... (الجاثیہ ۴۵: ۲۳) کیا تو نے اس شخص کو دیکھا (یعنی اس کے کردار پر غور کیا) جو اپنی خواہش کو اپنا معبود ومحبوب اور مطلوب ومقصود بناتا ہے؟ اور اللہ نے (اپنے قانونِ مکافات کے ذریعے) اُسے گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں اور دل ودماغ پر مُہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔ اب اللہ کے بعد کون ہے جو اسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتے یا سبق نہیں سیکھتے؟

اس آیتِ جلیلہ میں بھی مفصّلۂ ذیل چار نکات خصوصی توجّہ چاہتے ہیں: اوّل نفسانی خواہش کو اپنا اِلٰہ بنانے کا مطلب اسے یا معروضِ خواہش کو اپنا معبود ومحبوب اور مطلوب ومقصود بنانا ہے۔ دوم، اس کے نتیجے میں انسان گمراہ ہو جاتا ہے اور اس کے حواس اور دل ودماغ کے نظاموں میں جمود وتعطّل پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے فطری وظائف سرانجام دینے کے قابل نہیں رہتے۔ سوم، اپنی خواہش کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی راہِ راست پر نہیں لا سکتا۔ چوتھے، انسان کو ایسے گمراہ لوگوں کی زندگیوں سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ایسے گمراہ و ناکام لوگوں سے عبرت حاصل نہیں کرتے، وہ خود دوسروں کے لیے سامانِ عبرت بن جاتے ہیں۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جس طرح نفس کی خواہشات ان گنت ہیں، اسی طرح خواہش کے معروضات (OBJECTS OF DESIRE) بے شمار ہو سکتے ہیں، جن کو قرآنِ مجید نے "اصنام" سے تعبیر کیا ہے۔ دلیل کے طور پر مندرجہ ذیل آیتِ جلیلہ پیش کی جاتی ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ..... (الانعام ۶:۷۴): اور جب ابراہیمؑ نے اپنے بزرگ آزر سے کہا: کیا تو اصنام (یا بتوں) کو معبود بنایا ہے؟ میں تجھے اور تیری قوم کو صاف گمراہی میں دیکھتا ہوں۔

عربی، فارسی اور اردو زبانوں میں صنم کا لفظ نہ صرف بت یا معروضِ پرستش (OBJECT OF WORSHIP) بلکہ معروضِ حسن و محبت (OBJECT OF BEAUTY AND LOVE) کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، جو چیز چاہے جاندار ہو یا بے جان، ہماری معروضِ محبت و پرستش بن جائے، وہ ہمارا صنم یا بت ہوگی؛ مثلاً زندہ یا مردہ ہستیاں، جنہیں لوگ پیر و مرشد، فقیر و قلندر، درویش و مجذوب، غوث و ولی، امام و نجات دہندہ سمجھتے ہیں؛ نیز ان کے آستانے، مزار یا ان کی مورتیاں، مجسّمے، تصویریں، شبیہیں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اگر ہم کسی ایک یا ایک سے زائد بزرگوں کو اوتار یا بعض خدائی صفات کا حامل سمجھیں، مثلاً انھیں عالم الغیب، سمیع و بصیر، مستجیب الدعوات، غوث و دستگیر، رازق یا داتا، عزیز و قدیر، حیّ و قیّوم، حاجت روا و کارساز اور کاروبارِ خدائی میں شریک سمجھیں؛ نیز ان کو پکاریں، ان سے فریاد کریں، مرادیں مانگیں اور مدد طلب کریں تو وہ ہمارے اصنام یا آلِھَہ (= معبود) اور ہم ان کے پجاری، پرستار، عابد اور بندے ہوں گے۔ قرآنِ مجید کے نزدیک یہ شرک ہے اور شرک ظلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی جرم ہے؛ نیز یہ توحید کی ضد و نقیض ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں بار بار بنی نوعِ انسان کو اس بنیادی حقیقت و

صداقت اور دین کی اصل سے آگاہ کیا ہے کہ اُن کا اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود یا معروضِ پرستش ایک ہے اور فقط ایک ہے، دو، تین یا زائد نہیں ہیں، نیز وہ تنہا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مؤمن، مسلمان اور موحّد وہ شخص ہے، جو صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ بنائے۔ یہی توحید اور یہی اصلِ دین و ایمان ہے۔ علاوہ بریں اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے ہیں (الاحزاب ۳۳: ۴) بلکہ صرف ایک ہی دل بنایا ہے اور اس میں بیک وقت ایک ہی اِلٰہ سما سکتا ہے، لہٰذا انسان کا اِلٰہ اللہ تعالیٰ ہوگا یا غیر اللہ۔ اس سے ثابت ہوا کہ موحّد کے دل میں تنہا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور مُشرک کے دل میں غیر اللہ؛ نیز جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کا مدّعی ہونے کے باوجود اس کے سوا کسی دوسری ہستی یا ہستیوں کو اپنا اِلٰہ بناتا ہے اور اس کے نتیجے میں انہیں پکارتا، ان سے مرادیں مانگتا اور مدد طلب کرتا ہے، وہ جھوٹا، منافق اور ظالم و جاہل ہے اور یہی مُشرک کی صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے شرک پسند اور متشکّک طبائع کے دل و دماغ کو مطمئن اور اس امر کی توجیہہ کرنے کی خاطر کہ کیوں صرف اللہ تعالیٰ ہی اُلوہیّت کا سزاوار اور اِلٰہِ واحد ہے، متعدّد حقائق کو دلائل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان میں سے چند ایک کو نقل کیا جاتا ہے، لیکن ابتداء اس کی اس حرفِ آخر سے کی جاتی ہے کہ

۱۔ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ○ (البقرہ ۲: ۱۶۳):

اور تمہارا اِلٰہ یا معبود و مقصود ایک ہی معبود و مقصود ہے، اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں، وہ بے انتہا رحم کرنے اور سدا رحم کرنے والا ہے۔

اس نصِّ قرآنی میں دلیلِ اُلوہیّت رحمانیت و رحیمیت ہے۔ صفتِ رحمانیت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔

۲۔ اللہ (ہی اِلٰہ ہے) اس کے سوا کوئی معبود و مقصود نہیں (اس لیے کہ صرف)

وہی الحیّ یعنی زندہ بالذات ہے، اس لیے زندۂ جاوید اور موت سے ماوراء الوراء ہے، اور القیوم یعنی قائم بالذات اور اپنی مخلوقات کو قائم رکھنے والا ہے؛ نیز اُسے نیند آتی ہے نہ اونگھ یعنی ان سے وراء الوراء ہے علاوہ بریں وہ مالکِ کُل ہے، اس لیے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کرۂ ارضی میں ہے، اسی کے لیے ہے ..... وہ عالمِ کُل ..... اور عالی مرتبت اور انتہائی عظمت والا ہے (البقرہ ۲: ۲۵۵)۔

یہ آیۂ جلیلہ آیت الکرسی کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں جو صفاتِ اُلوہیت مذکور ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور ہستی میں نہیں پائی جاتیں، اس لیے کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی کائنات کا خالق و مالک ہے، اور زمین و آسمان میں جملہ جاندار و بے جان اشیاء اس کی مخلوقات، محتاج و پروردہ، اور مطیع و محکوم ہیں۔ چنانچہ جو ہستی خود مخلوق و حادث ہو، اپنی پیدائش و پرورش، حیات و بقا اور ترقی و نجات کے لیے اللہ تعالیٰ کی محتاج ہو، وہ نہ سزاوارِ اُلوہیت ہے اور نہ دوسروں کی اِلٰہ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ شرک کے خلاف ایسی برہانِ قاطع اور توحید کے حق میں ایسی دلیلِ محکم ہے کہ عقلِ سلیم اور قلبِ حسین ہو تو انسان اس کا انکار نہیں کر سکتا اور نتیجۃً شرک بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا انکار ظالم و جاہل ہی کر سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشرک ظالم و جاہل اور شرک ظلمِ عظیم ہے، جو ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ ہے (لقمان ۳۱: ۱۳، النسآء ۴: ۴۸: ۱۱۶)۔

۳۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، زمین میں نہ آسمان میں۔ وہی ہے جو ماؤں کے رحموں میں جس طرح چاہتا ہے، بناتا ہے۔ تیسرے، وہ عزیز یعنی ہر ہستی پر غلبہ و اقتدار رکھنے والا ہے؛ اور چوتھے، وہ مطلق و بالذات حکیم ہے۔

۴۔ اللہ (ہی حق ہے) کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف وہی۔ وہ ضرور تمہیں قیامت کے دن

(اپنے حضور) اکٹھا کرے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں (یہ خود اللہ کا کہنا ہے) اور اللہ سے بڑھ کر بات کہنے میں کون سچا ہو سکتا ہے؟ (النسآء ۴ : ۸۷)۔

قیامت کے دن کُل بنی نوع انسان کو ان کا محاسبہ کرنے کی خاطر دوبارہ زندہ کر کے اپنے حضور اکٹھا کرنے کی قدرت اللہ تعالیٰ کے سوا نہ تو کسی کو ہے اور نہ کوئی اِلٰہ ہو ہی سکتا ہے۔

۵۔ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، لیکن یہ نہ کہو کہ (معبود) تین ہیں۔ باز آ جاؤ۔ تمہارے لیے بہتر ہے۔ یقیناً اللہ ایک ہی اِلٰہ یا معبود ہے۔ وہ اس سے منزّہ و پاک ہے کہ اس کا بیٹا ہو۔ (وہ اس سے بے نیاز ہے؛ اس لیے بھی کہ) جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، اسی کا تو ہے اور اللہ ہی کافی و کارساز ہے (النسآء ۴ : ۱۷۱)۔

اس آیۂ جلیلہ میں اُلوہیت کے چار دلائل دیے ہیں: ایک یہ ہے کہ صرف اللہ ہی ایک ہے (لہٰذا اِلٰہ بھی ایک ہی ہونا چاہیے)۔ دوسرے، اسے اولاد کی ضرورت ہے نہ حاجت، اور وہ اس سے پاک و منزّہ ہے۔ تیسرے، وہ مالکِ کُل ہے اور کائنات کی جملہ اشیاء اُسی کی ہیں؛ اور چوتھے، وہ سب مخلوقات خصوصاً بنی نوعِ انسان کا کارساز اور ان کے لیے کافی ہے، لہٰذا انھیں کسی اور کارساز کی ضرورت ہے نہ حاجت۔

۶۔ کہو! وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ بے احتیاج و بے نیاز ہے، لیکن سب اس کے محتاج و نیازمند ہیں۔ نہ اُس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی کا جنا ہوا ہے، اور نہ کوئی اس کا کفو ہے؛ یعنی کوئی بھی ذات و صفات میں اس کا ہمسر نہیں ہے (اخلاص ۱۱۲ : ۱ تا ۴)۔

توحید پر یہ سورت قولِ فیصل اور حرفِ آخر ہے۔ اس میں معجز نما ایجازِ بلاغت سے

توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کی گئی ہے، لہٰذا اسے سورۂ اخلاص کہتے ہیں۔ چونکہ توحید اصلِ دین و ایمان اور قرآنِ مجید کا محور ہے اور سورۂ اخلاص آئینۂ توحید ہے، اس اعتبار سے اکثر مفسّرین اور علماء نے اسے ایک تہائی قرآنِ مجید کے برابر قرار دیا ہے۔ بہرحال، اس میں تعدّدِ آلِہَہ کے جملہ نظریات و معتقدات کی تردید کی گئی ہے، جو اُمّتِ مسلمہ سمیت دیگر اقوامِ عالم میں پائے جاتے ہیں۔ اس میں توحیدِ اُلُوہیّت کی یہ دلیل دی گئی ہے کہ جو شخص یکتا و بے مثال نہ ہو، بلکہ والد یا مولود ہو اور ضرورت و احتیاج رکھتا ہو، نیز اس کا کوئی ہم نسل، ہمسر اور مثیل ہو، وہ اِلٰہ نہیں ہو سکتا۔ چونکہ یہ تمام صفات صرف اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں، لہٰذا وہی ایک اِلٰہ ہے۔ جو لوگ جن میں بعض مسلمان بھی شامل ہیں، کسی برگزیدہ ہستی یا ہستیوں کو ایسی خدائی صفات سے متّصف سمجھتے ہیں، وہ محض اسمائے بے مسمّیات (یعنی جھوٹے، بے معنی و بے حقیقت ناموں) کی پرستش کرتے ہیں (الاعراف ۷: ۱۷۱؛ یوسف ۱۲: ۴۰؛ النجم ۵۳: ۲۳)۔

۷۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی اِلٰہ (معبود و مقصود) نہیں ہے؛ وہ عالم الغیب والشّہادۃ ہے، یعنی عالمِ غیب اور عالمِ ظاہری کی ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ وہی رحمٰن اور رحیم ہے۔ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں (اس لیے بھی کہ) وہ حقیقی بادشاہ ہے؛ نہایت مقدّس، سراسر سلامتی، امن دینے والا، نگہبانِ سب پر غالب مقتدر، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور شانِ کبریائی والا۔ اللہ پاک و منزّہ ہے اس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں۔ وہ اللہ ہی ہے جو کسی چیز کا خاکہ تیار کرنے والا اور اسے معرضِ وجود میں لانے والا اور صورت گری کرنے والا ہے۔ کُل حسین نام یا صفاتِ حسنہ اسی کے لیے ہیں۔ ہر چیز جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کی تسبیح کرتی ہے، اور وہ زبردست و مقتدر اور حکیم ہے (الحشر ۵۹: ۲۲ تا ۲۴)۔

ان آیاتِ جلیلہ میں اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت کو ثابت کرنے کے لیے اس کی صفاتِ حسنہ سے استدلال کیا گیا ہے اور بین السطور میں یہ بُرہانِ قاطع مضمر ہے کہ ذاتِ الٰہی کے سوا کسی ہستی میں بھی یہ صفات نہیں پائی جاتیں، لہٰذا وہ "اِلٰہ" نہیں ہو سکتی اور جو لوگ یہ صفات کسی مخلوق کی طرف منسوب کرتے اور اُسے اپنا اِلٰہ بناتے ہیں خواہ وہ کتنی برگزیدہ کیوں نہ ہو، وہ شرک کرتے ہیں اور بغیر علم کے ایسا کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ شرک کی بنیاد ہی ظلم و جہل پر ہوتی ہے۔

یہ نکتہ ازبس اہم اور غور طلب ہے کہ ہنود و نصاریٰ ہوں یا مجوس و بودھ پرست سب مشرک اقوام ہیں اور کھلم کھلا شرک کرتی ہیں اور انہوں نے شرک و بت پرستی پر اپنے اپنے دین کی بنیاد اُستوار کر رکھی ہے، لیکن اس واقعیت کے باوجود وہ شرک سے انکار کرتی ہیں اور اپنے آپ کو مُشرک کہلانا پسند نہیں کرتی، بلکہ اپنے آپ کو موحّد کہلانا پسند کرتی ہیں۔ اسی طرح اُمّتِ مُسلمہ، جس کے دینِ اسلام کی اساس ہی توحید ہے، اس میں بھی ایسے فرقے موجود ہیں، جو کھلم کھلا قبروں کو سجدہ کرتے، شبیہہ پرستی، پیر پرستی اور اکابر پرستی کرتے ہیں، نیز بیسیوں مشرکانہ رسوم کو عبادت سمجھ کر کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود شرک کے منکر اور اپنے آپ کو موحّد سمجھتے اور کہتے ہیں کیوں؟ اس کی متعدد وجوہ میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ شرک منکر ہے، اس لیے انسان طبعاً اس سے نفرت کرتا اور مُشرک کہلانا پسند نہیں کرتا۔

ب۔ شیطانِ نفسی۔ ابلیسی اپنی وسوسہ اندازی اور جالیاتی فریب کاری کے ذریعے شرک کی ہر قبیح و نجس صورت کو حسین و پاک بنا کر دکھاتا اور اس طرح مشرکوں کو باور کرا دیتا ہے کہ ان کے اعمال و عبادات مشرکانہ نہیں موحّدانہ ہیں، اس لیے حسین و پاک ہیں۔

ج۔ وہ بچپن سے اپنے آباؤ اجداد اور بزرگانِ قوم و ملّت کو شرک و بت پرستی عبادت کے طور پر کرتے دیکھتے اور اس کے باوجود انہیں اپنے آپ کو توحید پرست کہتے،

سنتے ہیں تو وہ بھی ایسا ہی کرنے اور سمجھنے لگتے ہیں، اور اپنے عقائد میں راسخ ہو جاتے ہیں۔

د ۔ انسان اَن گنت زمانوں سے کرۂ ارضی میں رہتے رہتے خوگرِ "محسوس" ہو چکا ہے، اس لیے محسوس کی پرستش و عبادت کو نامحسوس و غیر مرئی ہستی کی عبادت پر ترجیح دیتا اور دینے کا داعیہ رکھتا ہے۔

ہ ۔ آذروں یا جھوٹے اور سرطانی مذہبی پیشواؤں نے تاویل الباطل، تسمیہ بالباطل اور سحرِ سامری کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کرا دیا ہے کہ شرک کی ہر صورت (مثلاً غیر اللہ کی پرستش و عبادت اور اس سے مدد و مراد کا مانگنا) دُنیوی خیر، اُخروی حسنہ اور مراد و کامیابی حاصل کرنے کا مؤثر و مجرب ذریعہ ہے۔

و ۔ شرک حریفِ عقل و درایت اور دشمنِ علم و حکمت ہے، بلکہ یہ عقل و درایت اور علم و حکمت کو مار و کثر دم بنا دیتا ہے؛ لہٰذا اہلِ علم و دانش ہوں یا اہلِ قلم و فن، سحرِ آذری و سامری سے مسحور و مرعوب ہو کر شرک کے معاملے میں اپنے علم و دانش، اور عقل و فکر سے کام لینے کے قابل ہی نہیں رہتے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی ہر قوم میں اس کے فلاسفہ و سائنس دان اور سیاسی و مذہبی رہنما شرک و بت پرستی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ز ۔ آذروں نے تاویل بالباطل، تسمیہ بالباطل اور تشہیر بالباطل کے ذریعے مشہور کر رکھا ہے کہ شرک کی باتیں تصوّف، طریقت یا روحانیت کی پُر اسرار باتیں ہیں، جنہیں عقل سمجھ نہیں سکتی، لہٰذا ان کو بے سوچے سمجھے تسلیم کر لینا چاہیے، اور اسے وہ "ایمان بالغیب" اور "تسلیم و رضا" سے تعبیر کرتے ہیں؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع کیا ہے (الاسراء، ۱۷:۳۶)۔

ح ۔ آذری تصوّف و طریقت کا اصل الاصول یہ ہے کہ آذروں کو اپنا پیر و مرشد، شفیع و نجات دہندہ سمجھ کر ان سے اس قدر محبّت کرنی اور عقیدت رکھنی چاہیے کہ ان کی باتوں کو بے سوچے سمجھے اور بلا حیل و حجت تسلیم کر لینا چاہیے، اور عقل کو شجرِ ممنوعہ سمجھنا

چاہیے، حالانکہ یہ اصل الاصول قرآنِ مجید کی رُو سے باطل، مشرکانہ اور گناہِ کبیرہ ہے۔

۸۔ (اللہ تعالیٰ) مشرق و مغرب (یعنی جملہ عوالم) کا رازق و پروردگار، اور آقا و مالک ہے، لٰہذا اُسے ہی اپنا کارساز بناؤ (المزمل ۷۳: ۹)۔

اس آیۂ جلیلہ میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیتِ تامّہ کو اس کی صفتِ اُلوہیت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ صفتِ ربوبیت اس کے سوا کسی اور ہستی میں نہیں پائی جاتی، اس لیے وہ اِلٰہ ہوسکتی ہے نہ کارساز؛ لٰہذا انسان کو اپنا معبود و کارساز فقط اللہ تعالیٰ ہی کو بنانا چاہیے۔

۹۔ اب اللہ تعالیٰ الزامی جواب کے طور پر سوال کرتا ہے: کیا انہوں نے زمین سے اپنے معبود بنالیے ہیں، جو تخلیق کرتے ہیں؟ (الانبیاء ۲۱: ۲۱): اس میں صفتِ خالقیت کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرح کوئی ہستی کوئی چیز پیدا نہیں کرسکتی، بلکہ خود مخلوق و پروردہ ہے تو پھر وہ معبود و خُدا کیسے ہوسکتی ہے؟

۱۰۔ اگر دونوں (یعنی آسمانوں اور زمین) میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور بھی معبود یا خدا ہوتے تو ان دونوں میں فساد (خرابی و برہمی) برپا ہوجاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جو عرش کا ربّ ہے، اس سے پاک و منزّہ ہے جو وہ (مشرکانہ باتیں) بیان کرتے ہیں (الانبیاء ۲۱: ۲۲)۔

اس آیۂ جلیلہ میں نفسیاتِ حاکمیت اور سیاسی تاریخی واقعیّت کو دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ جب کسی زمان و مکان میں بھی ایک سے زائد خود مختار حکمران ہوئے ہیں نہ انہوں نے صلح و آشتی اور اتفاق و ہم آہنگی سے حکومت ہی کی ہے تو پھر کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں ایک سے زائد مطلق العنان حکمران یا خدا ہوتے تو ان میں فساد برپا نہ ہوتا؟ کائنات میں نظم و ضبط اور توازن و ہم آہنگی

کا پایا جانا اور ان گنت زمانوں سے نظامِ کائنات میں خرابی و برہمی کا پیدا نہ ہونا، اس بات کا زندہ اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ اس کا ناظم و قیّم اور حکمران و ربّ صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، جو ربّ العرش اور وحدہٗ لاشریک ہے۔

۱۱۔ اللہ تعالیٰ اپنی صفتِ اُلوہیت کو ثابت کرنے کی خاطر ادیانِ عالم کی تاریخ سے استشہاد کرتا ہے، جسے برہانِ قاطع کے طور پر پیش کیا جاتا ہے: "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا، جسے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی اِلٰہ نہیں، سو میری ہی عبادت کرو (الانبیآء ۲۱ : ۲۵)۔

یہ دلیل اس اعتبار سے واقعی بُرہانِ قاطع ہے کہ تمام ادیانِ عالم میں توحیدِ اُلوہیت کا عقیدہ پایا جاتا ہے لیکن یہ انسان کا ظلم و جہل ہے کہ

جانتا ہے پر مانتا نہیں

چنانچہ ہر دین کے اندر توحیدِ اُلوہیت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے اپنے دین میں طرح طرح کے مشرکانہ عقائد پھیلا دیے ہیں اور اپنے مریدوں، پیروں اور عام لوگوں کے لیے ایک سے زائد معبود بنا دیے ہیں جن کی وہ پرستش کرتے ہیں۔ ان میں بعض مسلم فرقے بھی ہیں، جو اپنے آپ کو توحید کے سب سے بڑے نقیب و علمبردار کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ ابلیس اپنی جالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی کے ذریعے ان کے مشرکانہ اعمال کو حسین بنا کر انہیں دکھاتا ہے اور وہ اس اس غلط فہمی کے شکار ہیں کہ شرک سے متعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاکؐ کے احکام کا اطلاق ان پر نہیں، صرف غیر مسلموں پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نام کے مسلمان شرک کریں تو جائز ہے، لیکن غیر مسلم کریں تو وہ ناجائز و ظلمِ عظیم ہے۔

۱۲۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ اُلوہیت کے ثبوت میں مفصّلۂ بالا دلائلِ قطعیہ کے علاوہ

اور بھی بہت سی دلائل و براہین دی ہیں، جن کو پیش کرنے کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے۔ آخر میں وہ مشرکین اور بت پرستوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر ان کے پاس اپنے موقف کی تائید میں کوئی دلیلِ محکم ہے تو پیش کریں؛ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: "کیا تم نے اس کے سوا اور معبود بنا لیے ہیں؟ اگر تم نے ایسا کیا ہے تو اس کی کوئی دلیلِ محکم پیش کرو (الانبیاء ۲۱: ۲۴)۔

۱۳۔ اللہ تعالیٰ نے شرک کے ابطال میں یہ بصیرت افروز دلیل دی ہے کہ جو ہستی قوتِ تخلیق نہیں رکھتی اور نہ کسی چیز کے کرنے پر قدرت ہی رکھتی ہو، وہ خدا و معبود کیسے ہو سکتی ہے؟ نیز جو شخص ایسی کمزور و ناتواں ہستی کو خدا سمجھے اور بنائے، اس کے ضعیف العقل و درماندہ ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔ غور سے سنو! اللہ کے سوا جن معبودوں کو تم (امداد و حاجت روائی کے لیے) پکارتے ہو، وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ (بس اتنا ہی نہیں بلکہ) اگر ایک مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ طالب و مطلوب یعنی مانگنے والے اور جن سے مدد مانگی جاتی ہے، دونوں کمزور و بے بس ہیں (الحج ۲۲: ۷۳)۔

۱۴۔ قرآنِ مجید کے نزدیک لوگوں کے شرک کرنے کی وجہ حقیقی اللہ تعالیٰ کی قدر ناشناسی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان عارف باللہ ہو، یعنی اسے اللہ جل شانہٗ کی عظمت و رفعت اور صفاتِ جمیلہ و جلیلہ کی معرفت ہو، اور اسے اس حقیقت کا یقینِ محکم ہو کہ وہ ربّ ذوالجلال والاکرام ہے، جو جبار و قہار، عزیز و قدیر، رحمان و رحیم، جمیل و جلیل، غفار الذنوب اور مستجیب الدعوات ہے تو وہ شخص

غیر اللہ کو کسی حال میں اپنا اِلٰہ و ربّ نہیں بنا سکتا اور نہ اُسے اللہ تعالیٰ کے کاروبارِ خدائی میں اس کا شریک ہی سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ مشرکوں سے متعلّق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ (الحج ۲۲: ۷۴): انہوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ نہایت قوّت والا اور زور آور ہے۔

۱۵۔ چونکہ شرک توحید کی ضد و نقیض اور ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ و ظلمِ عظیم ہے، لہٰذا یہ قرآنِ مجید کا بنیادی موضوع ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کی تعلیمات کا لُبِّ لباب اثباتِ توحید و نفیِ شرک ہے تو مبالغہ نہیں، اعترافِ حقیقت ہوگا۔ چنانچہ اس نے سورۃ المؤمنون میں اثباتِ توحید اور نفیِ شرک سے متعلّق ایسے ناقابلِ تردید دلائل دیے ہیں، جو دل میں اُتر جاتے ہیں، بشرطیکہ وہ سلیم ہو؛ بیمار و سقیم اور چٹان صفت نہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:

"ان (مشرکوں) سے پوچھو! اگر تمہیں، علم ہے تو بتاؤ کہ زمین اور وہ سب مخلوقات جو اس میں ہیں، کس کے لیے ہیں؟ وہ فوراً جواب دیں گے: "اللہ کے لیے۔" کہو پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے؟ (کیوں شرک کرتے ہو؟)۔

ان سے پوچھو!" وہ کون ہے جو ساتوں آسمانوں کا پروردگار و آقا اور عرشِ عظیم کا مالک ہے؟" وہ ضرور کہیں گے: "اللہ"۔ کہو! پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ (شرک کے نتیجے سے) ڈرتے نہیں؟

ان سے کہو: بتاؤ! اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ وہ کون ہے جس کے قبضۂ قدرت میں تمام چیزوں کی بادشاہت ہے؟ اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے، اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟" وہ فوراً کہیں گے: "یہ صفات تو اللہ ہی کے لیے

ہیں" کہو! پھر تمہیں کہاں سے دھوکا لگتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور بلاشبہ یہ (مشرک) جھوٹے ہیں۔ نہ تو اللہ نے کسی ہستی کو اپنا بیٹا بنایا ہے اور نہ کوئی دوسرا اِلٰہ (یعنی معبود خدا) اس کے ساتھ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ ان باتوں سے اللہ کی ذات پاک و منزّہ ہے جو یہ اس کی نسبت بیان کرتے ہیں۔ وہ غیب اور شہادت (نامحسوس و محسوس اور ظاہر و باطن) کا جاننے والا ہے۔ وہ اس شرک سے ورا اور بالا ہے جو وہ کرتے ہیں (المؤمنون ۲۳: ۸۴ تا ۹۲)۔

ان آیاتِ جلیلہ پر غور کرنے سے نفسیاتِ انسانی کا آئینہ دار یہ مقولہ یاد آجاتا ہے کہ

جانتا ہے پر مانتا نہیں

قرآنِ حکیم انسان کو اس کی اس نفسیاتی حقیقت سے طرح طرح سے آگاہ کرتا ہے کہ وہ توحید و شرک کو فطری طور سے جانتا اور پہچانتا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان شرک کیوں کرتا ہے، جو ناقابلِ معافی ظلم عظیم اور گناہِ کبیرہ ہے؟ یہ بڑا ہی اہم سوال ہے۔ اس کا جواب قرآنِ مجید کی رُو سے یہ ہے کہ شیطان اپنی جمالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی سے انسان کے مشرکانہ عقائد و اعمال کو مزیّن یعنی خوشنما و خوبصورت بنا کر دکھاتا ہے اور وہ اس جمالیاتی دھوکے میں مارا جاتا ہے (دیکھیے الانعام ۶: ۴۳، ۱۳۷؛ الانفال ۸: ۴۸؛ النحل ۱۶: ۶۳؛ النمل ۲۷: ۲۴ و بمواضع کثیرہ)۔ یہ حقیقت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے اللہ تعالیٰ خود بھی حسین و حُسن پسند ہے اور اُس نے انسان کو بھی صوری و معنوی لحاظ سے حسین و حسن پسند بنایا ہے (مفصل بحث کے لیے دیکھیے مصنّف کی کتاب جمالیات قرآنِ حکیم کی روشنی میں، طبع دوم نیشنل بک فاؤنڈیشن)۔

۱۶۔ محبّت بھی شرک کے عوامل و محرکات میں سے ہے۔ لوگ اجتماعی لحاظ سے میل ملاقات

راہ و رسم، مصاحبت و رفاقت، عصبیت و مودت اور موانست و دوستی کی خاطر، جس میں کئی قسم کی اغراض بھی مضمر ہوتی ہیں، اصنام پرستی اور مشرکانہ عبادات و رسوم میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ فکر انگیز و بصیرت افروز فلسفۂ شرک بالمودۃ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا تھا۔ اسے قرآنِ مجید نے ہر زمان و مکان کے انسان کے رُشد و ہدایت کے لیے اپنے اندر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے:

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي ...۝ (العنکبوت ۲۹: ۲۵): اور اس (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام) نے (اپنی قوم سے) کہا: "تم نے دُنیا کی زندگی میں تو باہمی محبت کی خاطر اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو معبود بنا لیا ہے، مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے، اور تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

یہ فلسفۂ شرک بالمودۃ ہماری زندگی میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے، لہٰذا اس کی مجملاً صراحت کر دی جاتی ہے۔ انسان اس دُنیا میں باہمی دوستی و محبت اور نصرت و تعاون کی خاطر غیر اللہ کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ غیر اللہ سے مراد زندہ ہستیاں بھی ہیں، مثلاً فرعون و ہامان اور قارون و آذر، جنہیں ہم معاشرتی سرطانوں سے بھی تعبیر کرتے ہیں؛ اور فوت شدہ ہستیاں اور ان کی قبریں، مجسمے، مورتیاں، شبیہیں اور آستانے بھی ہیں۔ الغرض غیر اللہ میں وہ تمام انسانی و حیوانی، نباتاتی و جماداتی، آبی و سماوی اور جذباتی و خیالی مخلوقات شامل ہیں، جنہیں مشرک اپنا معبود بنا لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح مشرکوں کو دُنیوی مفاد بھی حاصل ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے حامی و معاون اور دوست و مددگار بھی بن جاتے ہیں، لیکن یہ دوستی و معاونت دُنیوی زندگی تک ہی رہتی ہے۔ موت ان رشتوں کو منقطع کر دیتی ہے۔ چونکہ شرک باطل اور ظلمِ عظیم ہے اور اس کے ہیولے میں دشمنی و نفرت کی صورت مضمر ہے، لہٰذا جب یہ روزِ مجازات ظاہر ہوگی تو مشرکانہ

دوستی بھی منافرت و مخاصمت میں بدل جائے گی اور انھیں ان کے زندانِ ابدی؛ جہنم میں لے جایا جائے گا تو وہ ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور ان کا کوئی مددگار و پرسانِ حال نہ ہوگا۔

علاوہ بریں، مرید، مقتدی، پرستار، عقیدت مند، مدح سرا، خوشامدی وغیرہ وغیرہ سب اپنے پیروں، مرشدوں، معلّموں، فقیروں، خطیبوں، اماموں، نیز معاشرتی سرداروں کو اپنی گمراہی و ناکامی کا موردِ الزام ٹھیرائیں گے اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں گے کہ انھوں نے چونکہ ہمیں گمراہ کیا ہے، لہٰذا انہیں دو چند عذاب دے؛" اور وہ "بڑے" ان پر الزام دھریں گے اور کہیں گے کہ جب ربِّ کریم نے انھیں حواس اور قلب یعنی کان، آنکھیں اور عقل و فکر عطا کی تھیں تو کیوں انھوں نے ان سے کام نہ لیا، اور ہماری کورانہ تقلید و اطاعت کی؟ نیز ان کی خوشامد و چاپلوسی، عقیدت مندی و پرستاری اور اطاعت و تقلید کے باعث ہم گمراہ ہوئے اور اس کے نتیجے میں ہم مغرور و متکبر، سرکش و ظالم، خود ناشناس و خدا ناشناس اور شقی القلب و اہلِ نار بن گئے۔ یہ واقعیت قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان ہوئی ہے مثلاً سورۂ احزاب میں ربِّ جلیل فرماتا ہے:

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا ـ ـ ـ ـ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝

(۳۳ : ۶۷ ـ ۶۸) : اور وہ کہیں گے: اے ہمارے ربّ! ہم نے اپنے سادات (یعنی سرداروں، مذہبی پیشواؤں) اور بڑوں (یعنی وڈیروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں، سرمایہ کاروں، قارونوں، فرعونوں، ہامانوں وغیرہ وغیرہ) کی اطاعت کی اور اس کے نتیجے میں انھوں نے ہمیں راہِ راست سے گمراہ کر دیا (لہٰذا) اے ہمارے ربّ! تو ان کو دوچند عذاب دے اور ان پر لعنت فرما، بہت لعنت۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

"جب کوئی جماعت دوزخ میں داخل ہوگی تو اپنی ساتھی جماعت پر لعنت کرتی ہوئی

داخل ہوگی۔ یہاں تک کہ جب سب اس کے اندر ایک دوسرے کو پالیں گے تو بعد میں آنے والی ہر جماعت اپنی پیشرو جماعت سے متعلق کہے گی: "اے ہمارے ربّ! انھوں نے ہمیں گمراہ کیا، لہٰذا تو انھیں آگ کا دو چند عذاب دے۔ (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: ہر جماعت کے لیے دُہرا عذاب ہے مگر تم نہیں جانتے" (الاعراف ۷: ۳۸)۔

سورۂ زخرف میں ہے: "اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، سوائے متّقیوں کے" (۴۳: ۶۷)۔

قرآنِ حکیم نے شرک بالمودّۃ کے فلسفے کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ بار بار بنی نوعِ انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ وہ اور صرف وہی ان کا نشو و ارتقا کرنے والا، حافظ و ناصر، کارساز و مددگار، حامی و سرپرست، رفیق و دوست، وہّاب و مُعطی، جوّاد و کریم، رحمان و رحیم، حاجت روا و وکیل، غفّار الذنوب، توّاب الرحیم اور مستجیب الدّعوات ہے۔ چنانچہ عقلِ سلیم کا تقاضا یہ ہوا کہ ہم صرف اس کو اپنا دوست و کارساز بنائیں، بجائے اس کے کہ ہم انسانوں کو اولیآء یا دوست و سرپرست بنائیں۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی مثال مکڑی ایسی ہے، جو اپنے لیے ایسا گھر بناتی ہے جو دُنیا میں سارے گھروں سے زیادہ کچّا، بودا اور کمزور ہوتا ہے۔ چنانچہ ربّ العالمین پہلے اپنے بندوں میں اس حقیقت کا شعور بیدار کرنے کی خاطر کہ دُنیا اور آخرت دونوں میں ان کا دوست و سرپرست وہ ہے، فرماتا ہے:

نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (حٰمٓ السجدۃ ۴۱: ۳۰):

ہم ہی اس دنیا میں اور آخرت میں تمہارے اولیآء یعنی دوست و سرپرست ہیں۔

یہ انسان کا ظلم و جہل ہے کہ وہ ربّ ذوالجلال والاکرام کو چھوڑ کر اس کے بندوں کو اپنے اولیآء سمجھتا اور بناتا ہے۔ ان کے اس مُشرکانہ فعلِ عبث کو جو ان کے ظلم و جہل پر دلالت کرتا ہے، نہایت بصیرت افروز مثال بیان کرتا ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ .... اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ٥ (العنکبوت ۲۹: ۴۱ تا ۴۳):

جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو اپنے اولیاء یعنی دوست و مددگار بناتے ہیں، ان کی مثال مکڑی ایسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے؛ اور سب گھروں سے زیادہ بودا اور کچا گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش! یہ لوگ (یہ حقیقت) جانتے۔ یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو بھی پکارتے ہیں، اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ یہ مثالیں ہم بنی نوع انسان کے لیے بیان کرتے ہیں، مگر ان کو اہلِ علم ہی سمجھتے ہیں۔

ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ شرک کی بنیاد جہل و ظلم پر ہوتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ جھوٹے، جاہل، گمراہ اور ظالم ہوتے ہیں، لہٰذا وہ ادراکِ حقیقت نہیں کر سکتے، چاہے ان کے لیے کتنی ہی بصیرت افروز مثالیں بیان کی جائیں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ توحید کو علم اور شرک کو جہل مستلزم ہے۔

عیسائیوں کے عقیدۂ کفارہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اپنی اُمت کے شفیع مطلق ہیں، لہٰذا روزِ حساب آپؑ کی شفاعت کی بدولت کسی عیسائی مجرم و گناہگار کا محاسبہ ہوگا نہ اسے سزا ہی ملے گی بلکہ جملہ عیسائی مجرم و گناہگار بخشے جائیں گے۔ آزروں یعنی جھوٹی مذہبی پیشوائیت نے یہ عقیدہ برنگِ دیگر مسلمانوں میں بھی رائج کر دیا ہے چنانچہ علمائے سوء، جعلی پیروں اور فقیروں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ وہ قیامت کے روز اپنے مقتدیوں اور مریدوں کو اپنی سفارش سے عذاب سے چھڑا لیں گے اور ان کے گناہوں کا بوجھ اپنے سر لے لیں گے۔ قرآنِ مجید اس مشرکانہ عقیدے کی بار بار تکذیب و تردید کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ روم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ .... كٰفِرِيْنَ ٥ (الروم ۳۰: ۱۲-۱۳)۔

اور جب وہ ساعت (= قیامت کی گھڑی) برپا ہوگی، اس دن مجرم سخت نا امید

ہوجائیں گے، اور ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ان کا شفیع یا سفارشی نہ ہوگا؛ نیز وہ اپنے شریکوں کے منکر ہوجائیں گے۔

اس آیۂ جمیلہ کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو کوئی اللہ تعالیٰ کا شریک ہے اور نہ کوئی مشرکوں کا شفیع یا سفارشی ہے نہ ہوگا، چنانچہ قیامت کے دن مشرکوں کو نہ تو کوئی محاسبے سے اور نہ سزا ہی سے چھڑا سکے گا، چاہے وہ کتنی برگزیدہ ہستی ہی کیوں نہ ہو۔

سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ قانونِ مکافاتِ عمل کا یہ اصل الاصول اس طرح بیان کرتا ہے:

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا ..... تَخْتَلِفُوْنَ ہ (الانعام ۶: ۱۶۴):

کہو: کیا میں اللہ کے سوا اور رب (= داتا، غوث، دستگیر، حاجت روا، رازق، مددگار، آقا، مشکل کشا وغیرہ وغیرہ) کی طلب و جستجو کروں؟ حالانکہ وہی ہر شے کا رب ہے۔ ہر شخص جو کماتا ہے اس کا ذمے دار وہ خود ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا، پھر تم سب کو اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر واضح کر دے گا۔

حاصل کلام یہ کہ قرآنِ حکیم نے اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت کے ثبوت میں جو صفاتِ الٰہیہ کے طور پر پیش کی ہیں، وہ کسی اور ہستی میں پائی نہیں جاتیں، اس لیے کہ یہ امر محال ہے؛ لہٰذا مشرکین اپنے تعدّدِ آلہہ یعنی ایک سے زائد معبودوں کے عقیدے کے ثبوت میں کوئی دلیلِ محکم اور بُرہانِ قاطع پیش نہیں کر سکتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ شرک بے اصل و بے دلیل ہے اور اس کے برعکس توحید کی بنیاد حقیقتِ ثابتہ، دلائلِ محکم اور براہینِ قطعیہ پر استوار ہے۔ اس بحث سے امر کی بھی توجیہہ ہوجاتی ہے کہ کیوں توحید دین کی اساس اور ایمان کی روح اور ان دونوں کا اعتبار ہے، نیز کیوں شرک ظلمِ عظیم، جہل اور ناقابلِ عفو گناہِ کبیرہ ہے۔

توحید کا مطلب ہے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (محمد ۴۷: ۱۹): یعنی نہیں کوئی معبود وتحدا مگر اللہ۔

اِلّا اس کا مثبت تو لَا اس کا منفی پہلو ہے۔ ہم نے توحید کے مثبت پہلو سے قدرے تفصیل سے بحث کی ہے، اب ان کے منفی پہلو سے گفتگو کرتے ہیں۔ اِلّا اگر اس حقیقت پہ دلالت کرتا ہے کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی خدا، نیز معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود ہے اور صرف اسی کو اپنا اِلٰہ بنانا چاہیئے تو لَا میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی ہستی، آستانے، شے یا خواہش کو اپنا اِلٰہ نہیں بنانا چاہیئے؛ نیز ان تمام معبودانِ باطلہ کی نفی و تکذیب کرنی چاہیے، جو لوگوں نے بنا رکھے ہیں یا خود بن جاتے ہیں، جنہیں تلمیحِ قرآنی میں فرعون، ہامان، قارون اور آزر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس نکتے کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی صراحت کر دی جاتی ہے:

ا۔ سیاسی یا فرعونی معبود:

توحید کا ایک معنیٰ تو ہے: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ اور دوسرا معنیٰ ہے: لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف ۱۲:۴۰) "حکم دینا یا حکومت کرنا اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں، (لہٰذا) اس کا امر ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی اطاعت و پرستش (= عبادت) نہ کرو۔ یہی فطری و حقیقی دستورِ حیات (= دینِ قیّم) ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

اس آیۂ جلیلہ میں ان تمام مُتکبرین کی سیادت و عملداری اور حکومت کی نفی کر دی گئی ہے جو اپنی رعایا یا اپنے زیرِ اثر لوگوں پر احکامِ الٰہی کے بجائے اپنا حکم چلاتے اور اپنی مرضی سے ان پر حکومت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ ہے کہ کوئی فرد یا جماعت احکامِ الٰہی کے علاوہ کوئی آئین، قانون یا حکم نافذ نہیں کر سکتی اور نہ اس کے ساتھ حکومت ہی کر سکتی ہے۔ ایسا آئین یا احکام و قوانین صرف یہ نہیں کہ ناجائز اور ناواجب التعمیل ہوں گے، بلکہ احکامِ الٰہی کے لیے چیلنج اور دعوائے خدائی کے مترادف ہوں گے۔ اسی بنا پر ایسے مطلق العنان آمر یا حکمران کو مدّعیِ خدائی یا فرعون کہتے ہیں،

جو رعایا پر اپنے احکام خود یا اپنی مجلسِ دستور ساز کے ذریعے نافذ کرتا اور ان کی وساطت سے حکومت کرتا ہے۔ کلمۂ توحید کے حرفِ اوّل لَا کی رُو سے ایسے غیر قرآنی حکمران و احکام کا انکار و بطلان اہلِ ایمان کی اہم ترین ذمے داری ہے۔ ایسے حکمران و احکام کے خلاف جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر فرعون کی غلامی و محکومی سے نجات پانے کا احسن و مجرّب طریقہ "جہاد" ہے۔

فرعون لوگوں کو دھوکے میں رکھنے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کی خاطر دین یا رعایا کے نام پر حکومت کرتا ہے۔ دوسرے انہیں تشہیر بالباطل یا جھوٹے پراپگینڈے کے ذریعے لوگوں کو باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ صرف وہی ان کی نظریاتی و جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کر سکتا ہے۔ وہ نہ رہا تو ملک بھی نہ رہے گا۔ وہ خاص طور سے سرطانی طبقوں (بڑے بڑے زمینداروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں، سودی سرمایہ کاروں، مفت خور آزردوں وغیرہ وغیرہ) کو ڈر اتا رہتا ہے کہ اس کی حکومت نہ رہی تو وہ بھی اپنی جاگیروں، اراضی، مال و دولت، سیادت و سطوت اور عملداری و عزت سے محروم ہو جائیں گے۔

۲۔ ہامانی معبود:

ہامانیت سے مراد فرعونی حکومت کی کابینہ و انتظامیہ ہے۔ اگرچہ ہامان فرعون کے مُشیر ہوتے ہیں، لیکن اس کے مزاج، خواہش اور ضرورت کے مطابق مشورہ دیتے ہیں، چاہے وہ غلط ہو یا صحیح، مفید ہو یا نقصان دہ۔ وجہ یہ ہے کہ فرعون کو خوش رکھنا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا، ان کا مقصودِ زندگی ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، وہ فرعون کو اپنا اِلٰہ بنا لیتے ہیں؛ اور خدا کی طرح اس کی حمد و ثنا اور تعظیم و اطاعت کرتے اور اس کے احکام کی تعمیل کرتے اور کرواتے ہیں۔ فرعونی حکومت میں ہامان کے اختیارات

بہت زیادہ ہوتے ہیں اور وہ اس کے نام پر حکومت کرتے ہیں اور لوگوں پر مظالم توڑتے ہیں، اس لیے وہ خود بھی لوگوں کے "خدا" بن بیٹھتے ہیں۔ ابن الوقت، طالع آزما اور ضمیر فروش لوگ ہامانوں کو بھی اپنا خدا بنا لیتے ہیں، اور اِن کے صلے میں گوناگوں مراعات و مفادات حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ قارونی معبود :

قارون علامت ہے ظالم و سود خور، متکبر و خود پرست، حریص و بخیل اور قوم فروش و منافق سرمایہ دار کی۔ اس اعتبار سے اس تلمیحِ قرآنی کا اطلاق ان تمام زمینداروں، جاگیرداروں، سرداروں، خوانین، کارخانہ داروں، بینکاروں، سرمایہ داروں اور سرمایہ کاروں پر ہوتا ہے، جو دوسروں کو خاص کر اپنے مزارعوں، محنت کشوں، ملازموں اور خادموں کو حقیر و ذلیل اور محکوم و غلام اور اپنے آپ کو بڑا، مخدوم و مطاع، آقا و مالک اور رازق یا داتا سمجھتے ہیں ؛ اور لوگوں کو بھی ایسا سمجھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ علاوہ بریں وہ اپنے مال و دولت اور سرمائے (چاہے زرِ سیّال ہو یا زرِ منجمد) کی بنا پر اپنے مزارعوں محنت کشوں، آجروں، کرایہ داروں، کارندوں، ملازموں وغیرہ وغیرہ کا استحصال کرتے اور ان سے بٹائی، کرایہ، منافع، حصہ، پگڑی وغیرہ وغیرہ کئی ناموں سے سود لیتے ہیں۔ ان کی سود خوری و خون آشامی کی بنا پر ہم نے ان کے لیے معاشرتی سرطانوں کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اصل یہ ہے کہ فرعون و ہامان اور قارون و آزر معاشرتی سرطان ہیں، اور جس معاشرے میں یہ ہوں وہ اسلامی، قرآنی یا انسانی نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہی ہے۔ وہ سرطانی ہوتا ہے۔ چونکہ معاشرتی سرطان اپنے غرور و تکبر کے نشے میں اپنے آپ کو لوگوں کا معبود سمجھنے لگتے ہیں اور اپنی اپنی رعایا پر خدا کی طرح حکم چلاتے ہیں اور ان سے اپنی اطاعت و مدح سرائی کراتے ہیں، لہٰذا سرطان زدہ معاشرہ مشرکانہ ہوتا ہے۔

۴۔ آزری معبود :

آزر علامت ہے متکبر و بت پرست، مشرک و باطل پرست اور دشمنِ توحید و حق مذہبی پیشوائیت کی۔ شرک و بت پرستی کا نقیب و علمبردار یہ فرقہ سجادہ نشینی، پیری، مجاوری، فقیری اور مذہبی پیشوائیت کے نام پر لوگوں کا الٰہ بن جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں آزر لوگوں سے نذرانے وصول کرتے، ان کا استحصال کرتے، ان سے سجدے کرواتے اور اپنی شان میں قصیدے لکھواتے ہیں۔ دیگر سرطانی طبقوں کی طرح آزری طبقہ بھی اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، اور زہد و تقدس اور پیری و کرامت کے نام پر خدائی کرتا ہے۔ آزری طبقے کی دو نمایاں خصوصیات اُن کے فنون تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل ہیں۔ تسمیہ بالباطل کا مطلب کسی غیر اللہ کو ایسے نام یا ناموں سے موسوم کرنا، جن کے معانی کا وہ سزاوار نہ ہو یا وہ اس کے مقدور ہی میں نہ ہوں؛ مثلاً عالم الغیب، مستجیب الدعوات، حیّ و قیوم، قطب، غوث، دست گیر، مشکل کشا، داتا، رازق، سمیع و بصیر، حاجت روا و کارساز وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے قرآنِ مجید کی رُو سے یہ صفات فقط اللہ تعالیٰ کی ہیں، غیر اللہ کی نہ ہیں اور نہ ہو ہی سکتی ہیں۔ چنانچہ اس اعتراض سے بچنے اور اپنے تسمیہ بالباطل کو سچا ثابت کرنے کی خاطر آزروں نے تاویل بالباطل کا فن ایجاد کیا۔ اس کا مطلب کسی آیتِ قرآنی، اصطلاح، حدیثِ طیبہ یا آثار و اقوال کی جالیاتی فریب کاری یا طاغوتی براہین کے ذریعے ایسی تاویل و تشریح کرنا جو غلط ہونے کے باوجود نظر فریب اور رہزنِ عقل و ہوش ہو۔

یہ آزری معبود ہیں، جنہوں نے ہر زمان و مکان میں لوگوں کا استحصال کرنے کی غرض سے انھیں توحیدِ اُلوہیت و ربوبیت کی راہ سے ہٹا کر شرک کی راہوں پر لگا دیا۔ پھر ان کے مال و دولت کو دین و عقیدت کے نام پر ہتھیانے کی خاطر طرح

طرح کے باطل طریقے ایجاد کیے ؛ مثلاً بتوں، مورتیوں، شبیہوں، آستانوں، مقبروں وغیرہ وغیرہ پر چڑھاوے چڑھانے، نذر و نیاز دینے، برکات، نجات، جنت، مرادیں وغیرہ وغیرہ حاصل کرنے، تعویذ، گنڈے، جادو ٹونے کے عوض نذرانے لینے، کتاب اللہ کی آیات بیچنے، شادی و غمی کے موقعوں پر مختلف شکلوں میں نذرانے لینے کی رسمیں ایجاد کیں اور ان کو عبادت کا درجہ دے کر مقبولِ عام بنا دیا۔ علاوہ بریں، انہوں نے مالدار لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم انفاق بالعفو یعنی ضرورت سے زائد مال و دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے حکمِ الٰہی کی تعمیل کرنے کی نصیحت کرنے کے بجائے انہیں قارون بننے اور قارونی کرنے کے جواز میں فتوے صادر کر دیے۔ یہ کام انہوں نے ہمیشہ تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے ابلیسی فنون کے ذریعے کیا ہے اور اب بھی کرتے ہیں۔ قارونی کرنے سے مراد ہر قسم کے محنت کشوں، مثلاً مزارعوں، کسانوں، اجیروں، مزدوروں، پیشہ وروں، ہنروروں، ملازموں وغیرہ وغیرہ، نیز بیروزگاروں، حاجت مندوں، مفلوک الحال لوگوں کا استحصال کرنا، علاوہ بریں، مزارعت و مضاربت، اور احتکار و اکتناز کرنا اور بخل سے کام لینا۔ ان آزری معبودوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ...... مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ٥ (التوبۃ ۹ : ۳۴)۔

اے ایمان والو! یقیناً اکثر علماء اور درویش (= پیر و فقیر، سجادہ نشین و مجاور وغیرہ وغیرہ) لوگوں کا مال باطل طریقوں سے (مثلاً نذر و نیاز، تعویزوں، آیاتِ الٰہیہ اور فتووں کی فروخت، چڑھاوں وغیرہ وغیرہ کے ذریعے) ہضم کر جاتے ہیں اور (ان کے استحصال کی خاطر) انھیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

سیاق و سباق سے پتا چلتا ہے کہ یہاں اللہ کی راہ کا مطلب خصوصیت سے اللہ تعالیٰ کے حکم انفاق بالعفو (یعنی ضرورت سے زائد مال و دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دینے کے حکم) کی تعمیل سے روکنا ہے، کیونکہ یہ توحیدِ ربوبیت کی راہ ہے۔

ہمارے اس موقف کی تائید اس آیت کے متصل حصّے سے ہوتی ہے، جس میں رب العالمین فرماتا ہے: "جو لوگ سونا اور چاندی (یعنی مال و دولت) جمع کر کے رکھتے ہیں، اور ان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انھیں دردناک عذاب کی خوشخبری دو۔ ایک دن آئے گا جب اس زر و مال کو جہنم کی آگ میں دہکایا جائے گا، پھر اس کے ساتھ اس کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (پھر ان سے کہا جائے گا): یہ ہے وہ خزانہ، جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ لو اب اس دولت کا مزہ چکھو جو تم جمع کرتے تھے (۹: ۳۴ ـ ۳۵)۔

فصل ۔۲

توحیدِ ربُوبیّت

ہم معلوم کرچکے ہیں کہ عقیدۂ توحید دو اجزائے لاینفک سے مرکب ہے، اور وہ ہیں: اُلُوہیت اور ربوبیّت ۔ توحیدِ اُلُوہیّت کے عقیدے سے تو بحث ہو چکی ہے، اب عقیدۂ توحیدِ ربوبیّت سے گفتگو کی جاتی ہے۔ اس بنیادی اصطلاح کا مطلب ہے: تنہا اللہ تعالیٰ ہی نے کائنات اور اس کی جُملہ اشیاء کو پیدا کیا اور وہی ان کی روزی، نشو و ارتقاء اور رُشد و ہدایت کا انتظام کرتا ہے، نیز وہی ان کا حافظ و ناصر، مربّی و مزکّی، شافی و حاجت روا، مولیٰ و وکیل اور مُستجیب الدّعوات ہے۔ اس کی ضد و نقیض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی خواہ کتنی برگزیدہ و مقتدر کیوں نہ ہو، صفتِ ربوبیّت سے متصف نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ ہر مخلوق فطرۃً عبد و فقیر ہوتی ہے، اس لیے ربّ بن ہی نہیں سکتی۔ بالفاظِ دیگر، قرآنِ مجید کی رُو سے اس میں مندرجۂ بالا صفاتِ ربوبیّت کا پایا جانا محال ہے۔ انسان مخلوق ہے، اس لیے وہ فطرۃً ربّ چاہتا ہے تاکہ وہ اس کی روزی و پرورش، حفاظت و صیانت اور نشو و ارتقار کا موزوں انتظام و انصرام کرے۔ دوسرے، مربوبیّت اس کی فطرت

کا خاصّہ ہے۔ انسان طبعاً یہ حقیقت جانتا ہے کہ صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہی اس کا رب ہے، لیکن اس فطری اذعان و ایقان کے باوجود وہ اپنے اس عقیدے پر قائم نہیں رہتا اور متزلزل ہو کر غیر اللہ کو اپنا ربّ بنا لیتا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ خوگرِ محسوس اور تعجیل پسند ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے، لیکن بہت کم اس کا شعور رکھتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان شرک کیوں کرتا ہے؟ میرے نزدیک شرک کے بہت سے محرکات وعوامل ہو سکتے ہیں، لیکن اختصار کی خاطر یہاں چند ایک کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

اوّل: انسان خوگرِ محسوس ہے، اس لیے مرئی و حاضر کو غیر مرئی و غیب پر ترجیح دینے کا داعیہ رکھتا ہے، خواہ وہ اس کا حقیقی اِلٰہ و ربّ ہی کیوں نہ ہو۔

دوم: عجلت پسندی فطرتِ انسانی کا خاصّہ ہے۔ چنانچہ نفسیاتِ انسانی کا رازدان شیطان اس کی اس نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھانے اور بساطِ توحید پر اُسے اسی مہرے سے شہ و مات دینے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ وہ تعجیل پسند انسان کو اپنی جالیاتی فریب کاری اور وسوسہ اندازی کے ذریعے کسی محسوس ہستی کو اس کا ربّ بنا کر دکھاتا اور اس کے ذریعے اس کی مرادوں کو فوری طور سے برلانے کا وعدہ کرتا اور یقین دلاتا ہے تو انسان اس کے دھوکے میں آکر اس محسوس ہستی کو اپنا ربّ بنا لیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ توحیدِ ربوبیّت کے عقیدے سے عملاً منحرف ہو جاتا اور شرک ایسے ناقابلِ عفو جرم کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

سوم: نفسِ امّارہ کا وظیفہ خواہشات کو مسلسل پیدا کرنا اور انھیں شیطانِ ابلیسی کے تعاون سے حسین و دلکش بنا کر دکھانا اور حسن پسند انسان کو انہیں پورا کرنے کی تحریک کرتے اور ترغیب دیتے رہنا ہے۔

چہارم: انسان کو فکر و عمل اور انتخاب کی آزادی حاصل ہے۔ قدرت اس کی اس آزادی

کا احترام کرتی ہے، اس لیے کہ یہ آزادی اس کی ودیعت کردہ ہے اور دوسرے "لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ" اللہ تعالیٰ کی سنّت ہے۔ موضوعی۔ معروضی شیطان اپنی وسوسہ اندازی اور جالیاتی فریب کاری سے اُسے اپنی آزادی کے غلط و ناجائز استعمال پر اُکساتا رہتا ہے۔

پنجم : چونکہ انسان میں جذبۂ عبودیّت و مربوبیّت پایا جاتا ہے، لہٰذا وہ کسی مافوق الفطرت یا مقتدر ہستی یا ہستیوں کا بندہ و پروردہ بن کر رہنا چاہتا ہے۔ شیطان اس کے اس جذبے سے فائدہ اُٹھانے کی خاطر کسی غیر اللہ کو اپنی وسوسہ اندازی اور جالیاتی فریب کاری کے ذریعے مافوق العادت یا خدائی صفات کی حامل ہستی بنا دکھاتا ہے۔ انسان اس کے اس خوشنما دھوکے میں آکر متزلزل ہو جاتا ہے اور اپنے عقیدۂ توحیدِ ربوبیّت پر قائم نہیں رہتا اور اس کے نتیجے میں اُسے اپنا "ربّ" بنا لیتا ہے۔ اس طرح وہ انسانیت کے ارفع و اعلیٰ حُسن مقام سے گر کر اسفل سافلین بن جاتا ہے۔

بُت پرستی صرف مورتی پوجا یا مظاہر پرستی کا نام نہیں، بلکہ یہ نفس پرستی، پیر پرستی، آستانہ پرستی، قبر پرستی، شبیہہ پرستی اور اکابر پرستی وغیرہ وغیرہ سے عبارت ہے۔ چونکہ شرک و بُت پرستی منکرات ہیں، اس لیے انسان طبعًا ان سے نفرت دکھایا کرتا ہے اور انہیں اپنے نام کے ساتھ منسوب کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم شرک و بت پرستی کرنے کے باوجود اپنے آپ کو مشرک و بت پرست کہلانا پسند نہیں کرتی، اور نہ اپنے مُشرکانہ و بت پرستانہ عقائد و افعال کو توحید کے منافی ہی سمجھتی ہے بلکہ بخلاف اس کے تاویل یا باطل کے ذریعے انہیں عبادتِ الٰہی ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ میں بھی ایسے بہت سے فرقے پیدا ہو چکے ہیں جو صریحاً شرک کرتے اور مختلف ناموں سے بت پرستی کرتے ہیں، لیکن باوجود اس کے اپنے آپ کو

مؤمن و مُوَحِّد کہتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ جہلِ مرکب ہے، جو مسلم اقوام کی ذلّت و مسکنت کا ایک بنیادی سبب ہے۔ مسلمانوں کو مشرک و بت پرست بنانے کا ذمے دار آزری طبقہ ہے، لیکن دیگر فرعونی، ہامانی اور قارونی سرطانی طبقوں پر بھی اس کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے ایسے مسلمانوں کا ایمان معتبر نہیں، جو اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ و ربّ مان کر غیراللہ کو اپنا اِلٰہ و ربّ مانتے اور بناتے ہیں، لہٰذا وہ انھیں مخاطب کرکے فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ...... (النسآء ۴: ۱۳۶): اے مسلمانو! جو (زبان سے) ایمان لائے ہو، (عملاً) ایمان لاؤ، اللہ پر، اس کے رسولؐ پر اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری ہے، ایمان لاؤ اور......

یہ آیتِ جلیلہ ایمان یا مسلمانی کے اس اصل الاصول کی آئینہ دار ہے کہ اپنے آپ کو مسلمان و مؤمن کہنے یا سمجھنے سے کوئی شخص ایسا نہیں بن جاتا، بلکہ ایمان کو جزوِ زندگی بنا لینے اور اس کے مطابق عمل کرنے سے انسان حقیقت میں مؤمن و مسلمان بنتا ہے۔ یہ اصل الاصول باندازِ دیگر اس طرح بھی بیان ہوا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَ...... (البقرہ ۲: ۲۰۸): اے مسلمانو! تم سارے کے سارے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

اس آیہ میں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ شیطان اپنے حریف انسان کو دائرۂ اسلام سے باہر نکالنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے؛ لہٰذا جو شخص قرآنِ مجید کے بجائے شیطان کے احکام کی تعمیل کرتا ہے، وہ حدود اللہ سے تجاوز کر جاتا ہے، جسے غُلوفی الدّین کہتے ہیں؛ نیز وہ اپنے پیروکاروں کو گمراہ کر کے اللہ تعالیٰ، اس کے رسولؐ و کتاب سے دُور لے جاتا ہے اور ان پر ان کی منزلِ مقصود اور راہِ مستقیم گم کر دیتا۔

ہے۔ یہاں شیطان سے مراد خضر صورت و شیطان سیرت آذری طبقہ ہے، جو جلبِ منفعت، نذرانوں، منصبِ ارشاد و اقتدار اور عزّت وسطوت کی خاطر لوگوں کو تاویل بالباطل، تسمیہ بالباطل، سحرِ سامری اور طلسمِ آذری سے مرعوب و مسحور کرکے اپنے مرید، عقیدت مند اور پیروکار بناکر شرک و بت پرستی کی راہ پر لگا لیتا ہے۔ قرآنِ مجید اور احادیثِ طیّبہ کی رُو سے اِسے پیرویِ شیطان، بدعت، غُلُوفِی الدِّین، نفاق وغیرہ وغیرہ کئی ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اُلُوہیّت کا تعلّق محبّت سے ہے اور ربوبیت کا تعلّق حاجت سے ہے۔ چنانچہ انسان اس ہستی کو اپنا اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود بناتا ہے، جس سے محبّت کرتا ہے۔ پرستش کا مطلب محبّت و عقیدت ہے؛ اور جب اس میں عجز و انکساری اور اطاعت و فرماں برداری اور بندگی کے عناصر شامل ہوجاتے ہیں تو اسے عبادت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے مستنبط ہوا کہ عابد و پرستار کا محب و عاشق ہونا ضروری ہے۔ اس پر قرآنِ مجید کی مندرجۂ ذیل آیتِ جمیلہ سے اِستشہاد کر سکتے ہیں:

بنی نوعِ انسان میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے سوا کسی اور کو اس کا ہمسر (= اِلٰہ) بنا لیتے ہیں اور ان سے اللہ کی محبّت کی طرح محبّت کرتے ہیں؛ لیکن (بخلاف اس کے) اہلِ ایمان اللہ سے سب سے زیادہ محبّت کرتے ہیں (البقرہ ۲: ۱۶۵)۔

یہ آیۂ جمیلہ فلسفۂ ایمان و محبّت کی آئینہ دار ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے: اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب اُسے اپنا اِلٰہ و ربّ بنانا ہے؛ نیز ایمان شدید ترین محبّت کا متقاضی ہے، بلکہ یہ اس کا خاصّہ ہے۔ چنانچہ اہلِ ایمان کی ایک بنیادی صفت اور پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی پیاری سے پیاری چیز یا چیزوں سے زیادہ اپنے حقیقی اِلٰہ اللہ تعالیٰ سے محبّت کرتے ہیں۔ اس کی ضد و نقیض یہ ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو اہلِ ایمان کہتے اور سمجھتے ہیں اور پھر بھی اللہ تعالیٰ جتنی یا اس سے زیادہ غیر اللہ سے محبّت کرتے

ہیں، ان کا ایمان معتبر ہے نہ محبت، بلکہ دونوں ناخالص و ناقص ہیں۔ ایسے لوگ مشرک و منافق ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں، ایمان و محبت دونوں وحدت پسند ہیں، دوئی پسند نہیں اور دونوں کا خاصہ توحید ہے اور دونوں ایک اِلٰہ کو چاہتے ہیں، اور بلا شرکتِ غیرے چاہتے ہیں۔ محبت کی طرح ایمان کو بھی رشک گوارا نہیں، اس لیے کہ رشک رقیب یا شریکِ محبت پر دلالت کرتا ہے، جسے قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں شرک کہتے ہیں، شرک بنیاد ہے بت پرستی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) کی، اور دونوں کی مثال عقیدہ و عمل کی سی ہے۔

شرک کی نفسیاتی تحلیل کریں تو ہم پر مندرجۂ ذیل حقائق منکشف ہوتے ہیں:

۱۔ انسان حب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے تصرفات و اختیار یا کاروبارِ خدائی میں غیر اللہ کو بھی شریک مانتا اور اسے عملاً اپنا اِلٰہ و رب بنا لیتا ہے تو وہ اسے اللہ تعالیٰ کا ہمسر و ہم مرتبہ قرار دیتا ہے۔ یہ فعل ربِّ عزیز و قدیر کی شان میں ناقابلِ معافی گستاخی اور انسان کا اپنی جان پر ظلمِ عظیم ہے۔

۲۔ توحید سے انسان کی ذات میں وحدت اور شرک سے کثرت پیدا ہوتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مشرک کی ذات ایک سے زائد حصوں میں تقسیم ہو کر نامیاتی کل نہیں رہتی، اور اس کے نتیجے میں اس میں وحدت رہتی ہے نہ توازن؛ اسی طرح اس کے جمالیاتی ارتقاء کا امکان بھی نہیں رہتا۔

۳۔ ربِّ کریم نے انسان کے سینے میں صرف ایک دل بنایا ہے اور اس میں بیک وقت ایک ہی اِلٰہ سما سکتا ہے۔ چنانچہ جب انسان کے دل میں کوئی غیر اللہ اِلٰہ بن کر جاگزین ہو جاتا ہے تو ظاہر ہے وہاں اِلٰہِ حقیقی نہ رہ سکتا ہے اور نہ رہتا ہی ہے، لہٰذا اس کے رخصت ہوتے ہی محبتِ الٰہی کی شمع بھی خاموش ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان کا قلب بے نور یا اندھا ہو جاتا

ہے۔ نور ہی نہ رہے تو اس کے اِرتقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا مُشرک کے اِرتقائے نور یا جمالیاتی ارتقاء کا امکان ہمیشہ کے لیے ختم ہوجاتا ہے، لیکن اگر وہ شرک سے توبہ کرلے اور موحّد بن جائے تو جمالیاتی اِرتقاء کا امکان پیدا ہوجاتا ہے۔

۴۔ شرک سے اِنسان کے باطنی یعنی حِسّی، قلبی اور نفسی نظاموں میں ہم آہنگی و یکجہتی نہیں رہتی، بلکہ خرابی و برہمی پیدا ہو جاتی ہے، جس کے سبب اس میں دیگر خرابیوں کے علاوہ منافقت پیدا ہوجاتی ہے۔ نفاق قلب کا سرطانی مرض ہے، اور شرک و نفاق لازم و ملزوم ہیں۔

۵۔ اگرچہ شرک سے قریب قریب کُل صفاتِ اِلٰہیہ کی نفی لازم آتی ہے، لیکن اختصار کی خاطر چند ایک کی طرف مجمل اشارے کیے جاتے ہیں:

(ا) اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید کا ہے، یعنی ایک اِلٰہ اور ربّ کا، لیکن شرک ایک سے زائد اِلٰہ و ربّ چاہتا ہے۔

(ب) اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے؛ یعنی اس کی ذات و صفات اور کاروبارِ خدائی میں دوسرا کوئی شریک نہیں، لیکن مُشرک معبودانِ باطلہ کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر اور اس کی صفات اور کاروبارِ خدائی میں شریک مانتا ہے۔

(ج) اللہ تعالیٰ حیّ و قیّوم ہے، لیکن مشرک غیراللہ کو بھی زندہ اور قائم و دائم تسلیم کرتا ہے۔

(د) اسلام کی رُو سے صرف اللہ تعالیٰ ہی مستجیب الدّعوات ہے، لیکن مُشرک اس کے سوا بھی دوسروں کو مستجیب الدّعوات مانتا ہے، اور انھیں پکارتا اور ان سے امداد اور مرادیں مانگتا ہے۔

(ہ) قرآنِ مجید کی رُو سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حمد و ثنا اور عبادت کا سزاوار ہے،

لیکن مشرک غیر اللہ کی حمد و ثنا اور عبادت کرتا ہے؛ نیز اُن سے مرادیں مانگتا اور اُن کو اپنا حافظ و ناصر اور مولیٰ و وکیل، حاجت روا و کارساز سمجھتا اور مانتا ہے۔
الغرض، شرک کی تمام باتوں سے توحید کی نفی ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کی تکفیر لازم آتی ہے۔

۶۔ شرک باطل و بے بنیاد، کذب و تکذیب، نفاق و عدوان اور ظلم و جہل بھی ہے؛ اور انسان کی تذلیل و تحقیر اور اللہ تعالیٰ کی شانِ اقدس میں گستاخی اور اس سے سرکشی بھی ہے۔

۷۔ قرآنِ مجید کی رُو سے شرک عہد شکنی ہے۔ ایک اس عہد کی، جو انسان نے روزِ الست و شہود اپنے ربِّ رحمٰن و رحیم سے کیا تھا۔ دوسرے اس عہد کی، جو اہلِ ایمان ہونے کی حیثیت سے ہم ہر روز اپنی نمازوں میں کرتے ہیں۔ عہد شکنی سے ذاتِ انسانی کی شکست و ریخت ہوتی ہے؛ اس کی شمعِ قلب خاموش ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے نور کے ارتقاء و اتمام کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

۸۔ انسان کی اللہ تعالیٰ سے دُوری و مہجوری کے اسباب و عوامل میں شرک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

۹۔ شرک سے انسان عبدیّت کے ارفع و اعلیٰ مقام سے پھسل کر تحت الثریٰ میں جا گرتا ہے اور اس حالت میں قرآنِ مجید اس کو اسفل سافلین کہتا ہے۔

۱۰۔ شرک رہزنِ ایمان و تقویٰ اور غارتگرِ اطمینانِ دل و قرارِ جان ہے؛ نیز اس سے دل میں خوف و حزن کی آگ لگ جاتی ہے، جو اس کے نور کو بجھا دیتی ہے۔

۱۱۔ توحید اگر انسان کو صاحبِ حُسن و سُرور بناتی ہے تو شرک انسان کو نابینا اور اہلِ نار۔

۲۱۔ توحید اللہ تعالیٰ کی راہِ مستقیم ہے، جو موحّد کو اس کے اِلٰہ تک پہنچا دیتی ہے۔
بخلاف اس کے شرک ضلالت و ناکامی کی راہ ہے، جو مشرکوں کو ان کے
اِلٰہ سے دُور کر کے شرّ المآب میں پہنچاتی ہے۔

انسان فطری اور پیدائشی طور سے عبد اور فقیر (= محتاج) ہے۔ اگر وہ اپنے خالق اور ربّ ذو الجلال والاکرام کا بندہ و فقیر اور سائل و گدا بن کر زندگی بسر کرے تو اس کی یہ صفت حسین و قابلِ رشک اور اس کی امتیازی خصوصیّت بن جاتی ہے، نیز وہ اس کے لیے وجۂ شرف و عزّت، موجبِ عُلوِ مرتبت اور باعثِ فوزِ عظیم بن جاتی ہے۔ بخلاف اس کے اگر وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کا بندہ و فقیر اور سائل و گدا بن جائے تو یہ زندگی اس کے لیے ننگِ آدمیت، موجبِ تذلیل و تحقیر اور باعثِ محرومیِ جاوید بن بن جاتی ہے۔ بہر حال، چونکہ انسان فطرۃً عبد و محتاج ہے، لہٰذا عبودیت اور حاجت اس کی فطری مجبوری ہے۔ چنانچہ وہ اپنے جذبۂ عبودیت کی تشفّی کے لیے اِلٰہ یا معبود کو اور اپنی حاجت روائی کے لیے ربّ کو چاہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زندگی انسان کی عزیز ترین متاع ہے اور وہ ہر حال میں اور ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتا ہے؛ اور اس کے لیے اُسے بنیادی ضروریاتِ زندگی (مثلاً غذا، لباس اور مکان) کی حاجت ہوتی ہے۔ چونکہ صیانتِ ذات کا جبلّی تقاضا شدید ترین ہوتا ہے، لہٰذا شیطان اس کے اس تقاضے کو اس کی مجبوری بنا کر اسے [illegible] کرنے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو اپنا ربّ بنانے کی مسلسل تحریک کرتا اور ترغیب دیتا رہتا ہے۔ اس کا طریقۂ واردات یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی جادو بیانی، فریب کاری اور وسوسہ اندازی سے کسی بت پرستی (= اکابر پرستی، پیر پرستی، فقیر پرستی، قبر پرستی، شبیہہ پرستی، آستانہ پرستی، مظاہر پرستی، نفس پرستی، فرعون پرستی، ہامان پرستی، قارون پرستی اور آذر پرستی وغیرہ وغیرہ) کو حسنِ عبادت و حسنِ عمل بنا کر دکھاتا ہے اور انسان اس خوشنما دھوکے میں آ کر مُشرک و بُت پرست بن جاتا ہے اور ان میں

سے جو میسّر آئیں، انھیں اپنے ارباب بنا لیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اپنی دنیا و عاقبت خراب کر بیٹھتا ہے۔ ستم ظریفیِ جہالت یہ ہے کہ اس پر بھی وہ اپنے آپ کو مشرک و بت پرست نہیں بلکہ موحّد سمجھتا ہے۔ شرک اور جہل کی ایسی ہی باتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ظلوم و جہول کہا ہے۔ علاوہ بریں، شرک سے انسان کا نورِ باطن بجھ جاتا ہے اور اس کی روشنی و توانائی کے مفقود ہو جانے سے اس کے حسّی، قلبی اور نفسی نظاموں میں جمود و تعطّل پیدا ہو جاتا ہے، اور وہ اپنے وظائف سرانجام دینے کے قابل نہیں رہتے۔ اس صورتِ حال کی بنا پر اللہ تعالیٰ انسان کو "اندھا" کہتا ہے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی جتا دیتا ہے کہ جو شخص اس دنیا میں "اندھا" ہے، وہ آخرت میں اُٹھے گا (الاسراء ۱۷: ۷۲)۔ آخرت میں "اندھا" اُٹھنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو وہ جنّت میں جا سکے گا نہ اس کے مناظر ہی دیکھ سکے گا، دوسرے، وہ اپنے الٰہِ جمیل کی ہم نظری و ہمکلامی سے محروم رہے گا اور یہ محرومی سب سے زیادہ کربناک ہوگی۔ تیسرے، اندھے انسانوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا، جہاں وہ نہ زندہ ہوں گے نہ مردہ۔ چوتھے، چونکہ اس کے اندر نور بجھ چکا ہوگا اور وہ اس کی آب و تاب سے محروم ہوگا۔ لہٰذا اس کا جمالیاتی ارتقا نہ ہو سکے گا، جس کے نتیجے میں اس کی نجات اور جنّت میں جانے کا امکان بھی مفقود ہو جائے گا۔

شرک سے اگر انسان ظالم و جاہل، ملعون و محروم اور منافق و اہلِ نار بنتا ہے تو توحید سے صاحبِ حسن و سرور، ولی اللہ اور اہلِ جنّت بنتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سے عوامل و محرّکات کی بنا پر، جن کی طرف اشارے کیے جا چکے ہیں، توحیدِ ربوبیت پر بالخصوص قائم رہنا عام آدمی کے لیے دشوار ہوتا ہے؛ لیکن اگر وہ متّقی و متوکّل ہو اور "وفاداری بشرطِ استواری" اس کا شعارِ زندگی ہو تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے

کے سوا کسی اور کو اپنا الٰہ بنا سکتا ہے نہ ربّ۔ ایسے وفادار اور ایمانِ محکم رکھنے والے اہلِ توحید سے متعلق باری تعالیٰ فرماتا ہے: "جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا ربّ (یعنی رازق و نشوونما دینے والا آقا و مالک) ہے اور پھر وہ اس عقیدے پر قائم رہے (یعنی کسی اور کو اپنا رازق و داتا، حاجت روا اور دستگیر سمجھا نہ بنایا) تو یقیناً اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں": "کسی قسم کا خوف نہ کھاؤ اور نہ غم ہی کرو، اور خوش ہو جاؤ اس جنّت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے": "ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست ہیں اور آخرت میں بھی، وہاں (جنّت میں) جس چیز کی تمہیں خواہش ہوگی تمہیں ملے گی اور جس چیز کی تم طلب و آرزو کرو گے وہ تمہاری ہوگی، یہ مہمان نوازی و مدارات (ربِّ) غفور و رحیم کی طرف سے ہے" (حٰمٓ السجدۃ ۴۱: ۳۰ تا ۲۲)۔

دوسری جگہ ایسے راسخ العقیدہ موحِّدین سے متعلق ارشاد ہوتا ہے: "یقیناً جن لوگوں نے کہہ دیا (یعنی زبان سے اقرار کیا) کہ اللہ تعالیٰ ہمارا ربّ ہے، پھر اس بات پر ثابت قدم رہے (یعنی اس عقیدے کے مطابق زندگی کرتے رہے)، ان کے لیے نہ خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہی ہوں گے۔ یہی تو ہیں جو اہلِ جنّت ہیں، جہاں وہ ہمیشہ زندگی کریں گے، یہ جزا ہے ان اعمال کی جو وہ (دنیا میں) کرتے رہے ہیں" (الاحقاف ۴۶: ۱۴)۔

بات دراصل عقیدۂ توحید پر ثابت قدم رہنے کی ہے۔ کہنے کو تو اللہ تعالیٰ کو ماننے والا ہر شخص اُسے اپنا ربّ کہتا اور مانتا ہے، لیکن اپنے اس عقیدے پر قائم و دائم رہنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ اگر انسان اپنے نفس میں غور کرے اور اس کی کیفیات و خواہشات کا جائزہ لے اور ان کی نفسیاتی تحلیل کرے تو اپنے اندر کسی نہ کسی الٰہ یا معبود کو چھپا اور اپنے آپ کو اس کا پرستار پائے گا، بجز ان مؤمنوں کے جو عقیدۂ توحید کو اپنی زندگی کا جزوِ لاینفک بنا لیتے ہیں۔ انسان کے ظلم و جہل کو کیا کہیے کہ وہ اپنے نفس کے احوال و کیفیات اور آرزوؤں کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا اور نہ ایسا کرنے کا دماغ ہی رکھتا

ہے۔ اس پر بھی وہ اپنے آپ کو مردم شناس و دانشور سمجھتا ہے۔ محولۂ بالا آیاتِ جلیلہ میں اسی حقیقت کی طرف انسان کی توجہ دلائی گئی ہے، اور ساتھ ہی اسے یہ نویدِ جانفزا بھی دی گئی ہے کہ جو اہلِ ایمان توحیدِ ربوبیّت کے عقیدے کو اپنے اندر جذب کر کے اس کے مطابق زندگی گزارتے اور کسی مرحلے پر بھی متزلزل نہیں ہوتے، ان پر ربِّ کریم مندرجۂ ذیل انتہائی عظیم نعمتیں ارزانی کرتا ہے:

اوّل، یہ کہ اللہ تعالیٰ اُن پر فرشتے نازل کرتا ہے۔ فرشتے موحّدین کے لیے بارانِ رحمت اور جنّت کی نویدِ جانفزا لے کر آتے ہیں۔

دوم، موحّدین کے دلوں میں خوف رہتا ہے نہ غم۔ بارانِ رحمت سے ان کے اندر آتشِ خوف و حزن ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

سوم، ان کے دل طمانیت و سکینت سے معمور ہو جاتے ہیں اور رجایاتی ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں، جو کمیت میں بڑی ہی شدید اور کیفیت میں نہایت سرور انگیز ہوتی ہے۔

چہارم، قلب میں موجِ طمانیت و سرور کی طرح موجِ یقین بھی اُٹھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کا دوست و مددگار ہے۔ دُنیا اور آخرت دونوں میں، اور وہ اس کی جنّت میں اس کے مہمان بن کر رہیں گے اور جو چاہیں گے اُنھیں ملے گا، اور بن مانگے بھی ملے گا اور جو ملے گا ان کے وہم و گمان سے بھی زیادہ حسین و دلکش اور لذّت آفرین و سرور انگیز ہوگا۔

یہ سامنے کی بات ہے کہ مسلمانوں کے سمیت ہر دین کے متّبعین زبان سے تو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا خالق و رازق، پروردگار و حاجت روا، حافظ و ناصر اور مولیٰ و وکیل، علیم و خبیر، وہاب و جواد، رحیم و کریم اور توّاب و مستجیب الدعوات ہے، لیکن اس کے باوجود ان کا عمل یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری ہستیوں کو بھی ان صفاتِ الٰہیہ سے متّصف کر کے ان کو اپنا الٰہ و ربّ بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی شبیہوں، مورتیوں، قبروں

اور آستانوں کو پوجتے ہیں، اور انہیں مدد کے لیے پکارتے، ان سے فریاد و التجا کرتے اور مرادیں مانگتے ہیں، لیکن ان کے ظلم و جہل کا یہ حال ہے کہ وہ ان اعمال کو شرک سمجھتے ہیں نہ بت پرستی، اور جو جانتے بھی ہیں وہ مانتے نہیں مسلم معاشروں میں اس صورتِ حال کا اس کے تاریخی پس منظر میں جائزہ لیں تو ہم لامحالہ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس کے ذمے دار چار سرطانی طبقے ہیں، جن کے لیے ہم نے فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری طبقات کی تعبیر اختیار کی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان طبقات نے مل کر اسلامی معاشرے کو غیر قرآنی و سرطانی معاشروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ چونکہ مومن غیر قرآنی و سرطانی ملوکیت کو دل سے تسلیم نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا اس نے اپنی مدد کے لیے ہامانی، قارونی اور آزری طبقے پیدا کیے۔ ان طبقات نے اسلام، اُمّتِ مسلمہ اور دیگر اقوامِ عالم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے اور جب تک یہ رہیں گے، یہ حق کو نقصان پہنچاتے اور بنی نوع انسان کا خون چوستے رہیں گے۔

ان طبقات کے سرطانی شیطانی کارناموں کی فہرست تو طویل ہے، یہاں چند ایک کی نشاندہی کی جاتی ہے:

۱۔ انہوں نے خلافت کے بجائے ملوکیت کو جائز قرار دے دیا اور خلافت کے وظائف میں اس طرح ترمیم و تنسیخ کی کہ اس کے نظام کی ہیئت ہی تبدیل ہو گئی۔ آزروں نے ملوکیت کو خوش کرنے اور مراعات حاصل کرنے کی خاطر خلافت کی معنویت و اہمیت اور فرائض و وظائف سے مسلمانوں کو غافل کر دیا۔

۲۔ ملوکیت کفالتِ رعایا کے انتظام و انصرام کی ذمے داری سے دستبردار ہو گئی۔

۳۔ معاشرتی سرطانوں نے قرآنِ مجید کا نظامِ تعلیم تبدیل کر دیا، اور نصابِ تعلیم میں سے چار اہم چیزوں کو خارج کر دیا۔ اوّل، قرآنِ حکیم؛ دوم، قلم؛ سوم، تزکیہ، چہارم علومِ جدیدہ خصوصاً سائنس ٹیکنالوجی، ریاضی وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ معاشی نظام کی بنیاد سود پر استوار کر دی، اور سود کو مختلف ناموں سے

موسوم کر کے جائز قرار دے دیا، مثلاً مزارعت، مضاربت، کرایہ، پگڑی، حقِ نام و شہرت (GOOD WILL)۔

۵۔ احتکار و اکتناز اور بخل و تکاثر، اسراف و تبذیر اور سودی سرمایہ کاری کو جائز تسلیم کر لیا۔

۶۔ شرک و بت پرستی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) کو مروج کر کے عبادت بنا دیا۔

۷۔ اُمّتِ مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور اُسے لاتعداد فرقوں میں منقسم کر دیا۔

۸۔ تکریم انسانی کو ختم کر دیا۔

۹۔ عزّت و تکریم کا معیار قرآنِ مجید نے تقوٰی قرار دیا ہے، لیکن انہوں نے دولت و اقتدار اور شہرت و حاکمیت کو معیارِ عزت بنا دیا۔

۱۰۔ محنت کی اس قدر تذلیل و تحقیر کی کہ محنت کش کو حقیر و ذلیل اور اچھوت سمجھا جانے لگا۔

۱۱۔ انسان کو باطنی نور کے اِتمام و ارتقاء یا جمالیاتی ارتقاء کے معانی و مفہوم اور اہمیت سے غافل بنا دیا۔

۱۲۔ تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے فنون ایجاد کیے اور ان کی مدد سے قرآنِ مجید کی تحریفِ معنوی کی اور اس کی روح سے مسلمانوں کو نا آشنا کرنے اور بہتان تراشی اور تشہیر بالباطل کے ذریعے موحّدین کو ناحق بدنام کرنے اور لوگوں کی نظروں سے گرانے کی ایسی کوششیں کیں، جنہیں ناکام بھی نہیں کہہ سکتے۔

۱۳۔ شرک کے ذریعے ایک تو وحدتِ انسانی کو ختم کر دیا، دوسرے انسان کی شخصیت کو پارہ پارہ کر دیا، اور تیسرے اس کے نورِ باطنی کو بجھا کر اس کے اِرتقاء و اِتمام کا امکان ختم کر دیا۔

آذری اور قارُونی طبقوں کے ان سرطانی کارناموں سے متعلق قرآنِ مجید مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے تاکہ اُن سے بچیں اور خود بھی قارون بننے کی طلب و سعی نہ کریں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ

ہوتا ہے :

”اے مسلمانو! علماء اور مشائخ میں اکثریت ان کی ہے جو ناجائز طریقوں (مثلاً نذرانوں، چندوں، چڑھاووں، آیات کی فروخت جیسے تعویذ وغیرہ لکھنے کا معاوضہ وغیرہ وغیرہ) سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ (جو توحید کی راہ ہے) سے روکتے ہیں، اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انھیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو (التوبۃ ۹:۳۴)۔

اِس آیتِ جلیلہ میں مندرجۂ ذیل نکات خاص طور سے بصیرت افروز و سبق آموز ہیں: ایک یہ کہ لوگوں کو توحید کی راہِ مستقیم سے گمراہ کر کے شرک و بت پرستی کی راہوں پر لگانے مشرک و منافق علماء و مشائخ ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ نذرانوں، چڑھاووں وغیرہ کی شکل میں جو کچھ لوگوں سے لیتے ہیں، وہ حرام ہوتا ہے۔ یہی مفہوم علّامہ اقبالؔ نے اس شعر میں بیان کیا ہے:

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن (بالِ جبریل)

تیسرے، یہ جھوٹے پیر و فقیر اور علماء و مشائخ لوگوں کا استحصال اور جلبِ منفعت کرنے کی خاطر انھیں توحید کی راہ سے جو حقیقت میں اللہ کی راہ ہے، روکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ فقط موحّدین ہی کسی غیر اللہ کو نہ تو اپنا معبود بناتے ہیں نہ داتا، اور نہ بت پرستی (= قبر پرستی، پیر پرستی، آستانہ پرستی، شبیہہ پرستی وغیرہ وغیرہ) ہی کرتے ہیں، لہٰذا نہ ان کو نذرانے دیتے اور نہ مزاروں اور آستانوں پر چڑھاوے ہی چڑھاتے ہیں۔ چوتھے، مال و دولت کو جمع کرنا اور راہِ اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم انفاق بالعفو کی خلاف ورزی ہے، جو گناہِ کبیرہ ہے اور اس کی سزا دوزخ کا عذابِ الیم ہے، جس کی مجمل تفصیل یہ ہے: ”ان پر وہ دن آئے گا جب اس سونے چاندی پر جہنم کی آگ کو دہکایا جائے گا۔ پھر اس (دہکتی آگ) سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی۔ (پھر ان سے کہا جائے گا)۔ یہی

وہ دولت ہے جسے تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ لو اب اس دولت کا مزا چکھو (التوبہ ۹: ۳۵)۔

شرک سے متعلق یہ از بس اہم نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس سے دوہری بت پرستی لازم آتی ہے: ایک تو علمائے سُوء اور مشرک مشائخ کو، اور دوسرے فوت شدہ اولیاء اللہ اور بزرگوں کو اپنا الٰہ و رب بنانا پڑتا ہے؛ اور ساتھ ہی ان کے مزاروں اور آستانوں کی پرستش کرنا پڑتی ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشرے پر بدعات اور رسوم قبیحہ کے دروازے کھل جاتے ہیں اور شرک و بت پرستی کو عبادت سمجھ کر کیا جاتا ہے، جیسا کہ پاکستان میں ہوتا ہے۔

یہاں یہ بڑا ہی اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان شرک و بت پرستی کیوں کرتا ہے؟ یہ مسئلہ اپنے صحیح حل کے لیے تحلیلِ نفسی کا متقاضی ہے، لیکن انسان کی تحلیلِ نفسی اس کی عبدیّت کے حوالے سے کرنا ہو گی، اس لیے کہ وہ فطرۃً اللہ تعالیٰ کا بندہ اور محتاج ہے۔ چنانچہ اس تحلیلِ نفسی سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شرک کے چار بنیادی عوامل و محرکات ہیں: (۱) محبّت (۲) حاجت، (۳) خوف اور (۴) رجا۔ اب ان سے قرآنِ مجید کی روشنی میں فرداً فرداً بحث کی جاتی ہے:

۱۔ محبّت میں عقیدت و پرستش اور بندگی کے عناصر شامل ہو کر شدید ہو جائیں تو وہ عبادت بن جاتی ہے۔ عبادت کا مطلب ہے: عشق و پرستش اور اطاعت۔ (۱) عشق کا مطلب ہے: شدید ترین محبّت جس کا صرف اللہ تعالیٰ سزاوار ہے۔ (۲) پرستش کے معانی ہیں: اپنے معبود سے شدید محبّت کرنا، اس کی حمد و ثنا کرنا، اس کی یاد کو حرزِ جان بنانا، اس کے آگے سرِ نیاز خم اور جبہ سائی کرنا یا اصطلاحِ قرآنی میں رکوع و سجود کرنا؛ نیز اس سے اُمیدیں وابستہ رکھنا، شرک ہے، جسے علامہ اقبالؔ نے کافری سے تعبیر کیا ہے:

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نو امیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

اطاعت کے معنی ہیں بغیر حیل و حجت کے کہا ماننا اور اوامر و نواہی کی تعمیل کرنا۔ انگریزی میں ایک شاعر نے اطاعت کی اس طرح تعریف کی ہے: NOT TO REASON WHY, BUT TO DO AND DIE، یعنی چون و چرا نہ کرنا، بلکہ تعمیلِ ارشاد میں جان سے گزر جانا۔ غیر اللہ کی ایسی اطاعت کرنا شرک ہے، اس لیے کہ جن لوگوں کی ایسی اطاعت کی جائے وہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اطاعت کرنے والوں کے ارباب (= ربّ کی جمع) ہوتے ہیں۔ اس موقف کے ثبوت میں مندرجۂ ذیل آیتِ جلیلہ اور حدیثِ طیبہ پیش کی جاتی ہیں:

"کہو! اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں (طور پر مسلّم) ہے؛ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا ربّ نہ بنائے" (آلِ عمران ۳: ۶۴)۔ ترمذی نے عدیؓ بن حاتم سے روایت کی ہے کہ یہ آیتِ جمیلہ نازل ہوئی تو اہلِ کتاب میں سے جو مسلمان ہو چکے تھے، انھوں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے تھے۔" آپؐ نے فرمایا: کیا یہ واقعہ نہیں کہ وہ (علماء و مشائخ) تمہارے لیے جن چیزوں کو حرام و حلال قرار دیتے، تم ان کی باتوں پر عمل کرتے تھے؟" انہوں نے جواب دیا: "ہاں! ہم ایسا ہی کرتے تھے۔" آپؐ نے فرمایا: یہی تو عبادت ہے۔" عبادت کے مفہوم کی اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ میں اس طرح وضاحت فرمائی ہے: "انھوں (یعنی نصاریٰ) نے اپنے عالموں اور راہبوں (مشائخ) کو اللہ کے سوا اپنا ربّ بنالیا ہے؛ حالانکہ (حضرت) مسیح بن مریمؑ اور ان کو اس کے سوا اور کوئی حکم نہ دیا گیا تھا کہ فقط ایک معبود کی عبادت کریں۔ کوئی معبود نہیں بجز اس کے۔ وہ یعنی اللہ تعالیٰ منزّہ ہے اس سے جو وہ شریک ٹھیراتے ہیں (التوبہ ۹: ۳۱)۔

کیا یہ امر واقعی نہیں کہ مسلمانوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے یہود و نصاریٰ اور ہنود و مجوس اور دیگر مشرک اقوام کی طرح اپنے علماء و مشائخ کو اپنے ارباب بنا رکھا ہے اور ان کی باتوں اور احکام کو اللہ تعالیٰ کی باتوں اور احکام کی طرح مانتے ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے اور یقیناً ہے اس لیے کہ یہ سامنے کی بات ہے تو پھر ان کے مشرک ہونے میں کیا کلام ہے؟ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حقیقت کے باوجود مشرک مسلمان اپنے آپ کو مؤمن و موحد کیوں کہتے اور سمجھتے ہیں؟ میرے نزدیک اس کا مختصر اور سچا جواب قرآنِ حکیم کی زبان میں یہ ہے: اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ہ (الاحزاب ۳۳: ۷۲)۔ بلاشبہ وہ یعنی انسان بڑا ہی ظالم و جاہل ہے۔

یہ بحث تو جملۂ معترضہ کے طور پر آگئی۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ شرک کا ایک بنیادی محرک و سبب محبت ہے۔ انسان غیر اللہ کے جذبۂ محبت میں سرشار ہو جائے تو شیطان کو اسے اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری کے ذریعے حدود اللہ سے باہر نکالنے میں زیادہ دقت پیش نہیں آتی۔ یہی غلو فی الدین یعنی دین میں حد سے زیادہ تجاوز کر جانے کا ایک بنیادی سبب بھی ہے۔ اس معاملے میں شیطان کا طریقِ واردات (MODUS OPERANDI) یہ ہوتا ہے کہ انسان کا معروضِ محبت و عقیدت کوئی ایسی ہستی ہو جسے وہ اپنا پیر و مرشد، امام، ولی اللہ، بزرگ وغیرہ وغیرہ سمجھتا ہو تو شیطان اپنے جمالیاتی فریب کے ذریعے اُسے مافوق الفطرت انسان بنا کر دکھاتا ہے، پھر اس سے طرح طرح کی کرامتیں منسوب کرتا اور آخر میں اُسے صفاتِ الٰہیہ سے متصف کر کے دکھاتا ہے۔ اس طرح اس ہستی کو اُلوہیت و ربوبیت کے مقام پر متمکن دکھا کر اپنے پیروکاروں کو اس کے پرستار، سائل اور گدا بنا دیتا ہے۔ شیطان کے یہ پیروکار اس ہستی کی زندگی میں اس کے وجود کے سامنے سرنگوں ہوتے، جبہ سائی کرتے اور اسے اپنا حاجت روا، مشکل کشا، کارساز و داتا، عالم الغیب و مستجیب الدعوات مان کر اس سے مرادیں مانگتے اور ان کے

سامنے اپنی حاجات پیش کرتے اور ان کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔ پھر اس کی وفات کے بعد اس کی قبر، شبیہہ، آستانے اور مورتی کی پرستش کرتے ہیں، اور اسے مدد کے لیے پکارتے اور مرادیں مانگتے ہیں۔

آرزوئے ادراک، حسنِ نیّت اور خلوص دل سے سوچنے اور بار بار سوچنے کے باوجود یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جو شخص زندگی میں انسان کی طرح دو چار لوگوں کی باتیں بیک وقت نہ پوری طرح سن اور سمجھ سکتا ہو اور نہ ان کا جواب ہی دے سکتا ہو، وہ وفات پا جانے کے بعد سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں کی دعاؤں کو بیک وقت کیسے سن اور سمجھ سکتا اور جواب دے سکتا ہے؛ نیز وہ عالم الغیب اور مستجیب الدعوات کیسے بن سکتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں وہ بشر اور بندۂ محتاج سے "خدا" کیسے بن جاتا ہے؟ اس ضمن میں عقلِ سلیم اور حکمتِ قرآن کا فتویٰ یہ ہے کہ یہ شیطان کے جادوئی فریب کا کمال ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو اس قدر ظالم و جاہل بنا دیتا ہے کہ وہ ایسی محال، غیر معقول اور انتہائی احمقانہ باتوں پر ایمان لے آتا ہے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو مومن و متقی، عابد و زاہد، موحّد و صالح اور عالم و فاضل سمجھتا ہے؛ حالانکہ وہ مشرک، وبت پرست اور ظالم و جاہل بن چکا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مفصلۂ ذیل آیاتِ جلیلہ میں عبادت اور شرک کی صراحت بلیغ و بصیرت افروز انداز میں کی ہے:

"ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے، لہٰذا اللہ کی عبادت اس کے دین کے لیے مخلص ہو کر کرو۔ خبردار! اللہ کے لیے شرک سے پاک و منزّہ یا خالص دین ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا دوسرے اولیاء یا سرپرست و حامی بنا رکھے ہیں (اور اپنے اس عمل کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ) ہم تو اُن کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں اللہ کے قریب اور اس تک رسائی کرا دیں۔

اللہ یقیناً ان کے درمیان ان تمام باتوں کا فیصلہ کرے گا، جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اللہ ایسے کسی شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکرِ حق ہو" (الزمر ۳۹: ۲ تا ۳)۔

ان آیات میں مفصلۂ ذیل نکات خاص طور پر قابلِ غور ہیں، اوّل، اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ایک تو اخلاص ہونا چاہیے، اور دوسرے صرف اسی کے لیے ہونی چاہیے؛ لہٰذا اس کی حمد ثنا، پرستش و اطاعت میں کسی دوسری ہستی کی عبادت کا شائبہ تک نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی صراحت خود اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ اس طرح کر دی ہے:

"کہہ دو! میرے ربّ نے یقیناً مجھے راہِ راست دکھا دی ہے؛ جو راست و پائیدار دین ہے، (حضرت) ابراہیمؑ کا دستورِ حیات سب سے کٹ کر ایک خدا ہی کے لیے ہو جاتا ہے اور ابراہیمؑ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہہ دو! میری صلوٰۃ میرے تمام مراسمِ عبودیّت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ ہی کے لیے جو کُل جہانوں کا ربّ ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور مَیں سب سے پہلے فرماں بردار ی کرنے والا ہوں (الانعام ۶: ۱۶۱ تا ۱۶۳)۔

یہ بات خاص طور سے ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ خالص دین سے مراد ایک تو شرک کی ہر آلائش سے پاک (منزّہ) دین ہے اور دوسرے زندگی کے ہر شعبے میں فقط ایک اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا اِلٰہ و ربّ سمجھنا اور ماننا اور اس پر توکّل کرنا، نیز صرف اور فقط اسی کی عبادت کرنی ہے۔ عبادت کسی نیّت سے کی جائے، عبادت ہی ہوتی ہے اور غیر اللہ کی عبادت ہر حال میں شرک ہے؛ نیز اللہ تعالیٰ کا تقرّب براہِ راست ملتا ہے اور یہی اس کی خالص عبادت ہے۔ انسان جب تمام مزعومہ وسیلوں، سہاروں اور اولیا سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کا ہو رہتا ہے تو اس کا مقرّب بن جاتا ہے۔ اس کے مقرّب کی صفت یہ ہے کہ اس کی نماز مع لوازمات کے اور دیگر جملہ مناسکِ عبادت، نیز اس کا جینا اور مرنا فقط ایک اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ سفارش و وسیلے

سے ملتا ہے، آذری پیشوائیت کی ایجاد ہے، اور قدیم زمانے سے اقوامِ عالم میں پایا جاتا ہے۔ عبرت کا مقام ہے کہ تحریکِ توحید کی علمبردار امتِ مسلمہ کے کئی فرقوں میں بھی یہ عقیدہ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے اس موقف کے ثبوت میں عموماً یہ دلیل دیتے ہیں کہ جس طرح بادشاہوں، راجاؤں، نوابوں اور اہلِ اقتدار وغیرہ وغیرہ کی باریابی کے لیے وسیلے اور سفارش کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح (نعوذ باللہ) ربِّ رحمٰن و رحیم کا قرب حاصل کرنے، نیز اس تک اپنی حاجات کو پیش کرنے اور مرادیں برلانے کے لیے بھی کسی وسیلہ و سفارش کی حاجت ہوتی ہے۔ محولہ بالا آیاتِ جلیلہ میں اس عقیدے کا ابطال کیا گیا ہے۔ غور کریں تو اس عقیدے سے اللہ تعالیٰ کی ان بنیادی صفات کی نفی لازم آتی ہے کہ وہ اپنی محسن و محبوب مخلوقات خصوصاً بنی نوعِ انسان کا رازق، نشو و نما کرنے والا، مولیٰ و نصیر، حافظ و ناصر، کارساز و حاجت روا، مشکل کشا و دستگیر، رحمٰن و رحیم، وہّاب و کریم، محسن و معطی اور مستجیب الدعوات ہے اور سفارش و وسیلے سے بے نیاز ہے، یعنی سبحان و صمد ہے۔ علاوہ بریں، یہ کہ ایک تو اس نے اپنی رحمت کو اپنے اوپر لازم کر رکھا ہے اور اس کی رحمت ہر چیز کو محیط ہے؛ دوسرے اسے اپنی جمالیاتی تخلیقی فعلیت، کے شہکاروں یعنی افرادِ نسلِ انسانی سے اس قدر محبت ہے کہ انسان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کی اپنے بندہ و محتاج انسان سے محبت و شفقت دُنیا جہان کی کُل حیوانی و انسانی ماؤں کی مامتا کے مجموعے سے زیادہ ہے۔ بہرحال، قرآنِ مجید کی رُو سے مشرکین کا یہ عقیدۂ وسیلہ و سفارش جھوٹا اور انکارِ حق کے مترادف ہے۔ لہٰذا ایسا عقیدہ رکھنے والے ایسے گمراہ ہوتے ہیں کہ قدرت کے قانونِ مجازات کی رُو سے وہ اپنی حقیقی منزل اور اس کی راہِ مستقیم کو نہیں پا سکتے۔

حاصلِ کلام یہ کہ انسان فرطِ محبت و عقیدت سے اپنے آئمہ و مشائخ، سیاسی و عسکری ابطال، شہداء، مذہبی علماء و صوفیہ، پیروں اور فقیروں کی یادگاریں قائم کرنے کی خاطر ان کے روضے، شبیہیں اور مجسمے بناتے ہیں، پھر ان پر چادریں چڑھاتے اور چراغ جلاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ ان سے کرامات اور ایسی صفات منسوب کر دیتے ہیں جن کا فقط اللہ تعالیٰ ہی سزاوار ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ لوگوں کے معبود بن جاتے ہیں اور ان کی پرستش شروع ہو جاتی ہے ضعیف الاعتقاد لوگ ان کی نذر و نیاز دیتے، ان کی قبروں پر چڑھاوے چڑھاتے گرہیں باندھتے، ان کو سجدے کرتے، ان سے مرادیں مانگتے اور ان کو امداد کے لیے پکارتے ہیں۔ اس کے باوصف وہ اپنے ان مشرکانہ افعال کو شرک و بت پرستی سمجھنے کے بجائے عبادت اور اپنے آپ کو مؤمن و موحّد خیال کرتے ہیں۔ ایسے مشرک، ناقابلِ اصلاح ہوتے ہیں۔

۲۔ حاجت شرک کی دوسری بنیادی وجہ ہے۔ انسان فطری طور سے اللہ تعالیٰ کا فقیر یا محتاج ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کی اس اصلیت سے اس طرح آگاہ کرتا ہے:

"اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ! وہ تو بے نیاز و بے احتیاج اور ستودہ بالذّات ہے (فاطر ۳۵: ۱۵)۔

اس آیتِ جمیلہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کی جبلّتِ احتیاج اور اپنی صفاتِ غنا و محمودیّت پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے تاکہ اسے اس حقیقت کا ایقان و اذعان ہو جائے کہ وہ بدنی اور نفسی ہر لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیّت کا محتاج ہے، کسی اور کا نہیں، لہٰذا اسے صرف اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور فقط اسی کو اپنا حاجت روا سمجھنا چاہیے۔ اس آیت میں دوسرا اہم و فکر انگیز نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی غنی و حمید نہیں، بلکہ سب اس کے محتاج و نیازمند ہیں، لہٰذا وہ نہ تو حاجت روا و کارساز اور نہ حمد و پرستش کے سزاوار ہی ہیں۔ یہ اس قدر اہم حقیقت ہے کہ اگر انسان سمجھ لے تو وہ خود آگاہ و خدا آگاہ بن سکتا ہے۔ یہ آگہی جہاں انسان کو مؤمن و موحّد، متّقی و متوکّل اور صاحبِ تسلیم و رضا بناتی ہے، وہاں اسے متکبر و سرکش،

ظالم و جاہل اور مشرک و بندۂ حرص و ہوا بننے سے بچاتی ہے۔ اگر وہ حکمران یا عمائدین سلطنت میں سے ہو تو اسے نہ تو فرعون بننے دیتی ہے نہ ہامان۔ اسی طرح اگر وہ سرمایہ دار ہو یا عالم تو اُسے قارون یا آذر بننے میں مانع آتی ہے۔ الغرض، انسان پر جب یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ کُل بنی نوع انسان اللہ تعالیٰ کے بندے اور فقیر یا محتاج ہیں اور وہ سب کی مادّی و نفسی حاجات پورا کرنے والا ہے تو وہ اپنے جیسے بندہ و فقیر کو نہ تو اپنا حاجت روا سمجھ سکتا اور نہ اس کے سامنے سرِ نیاز خم ہی کر سکتا ہے، نیز نہ اُسے مدد کے لیے پکار ہی سکتا ہے۔

انسان کی محرومی و نامرادی کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ ظالم و جاہل بن جائے تو خود آگاہ و خدا آگاہ نہیں رہتا اور اس کے نتیجے میں اُسے ربّ ذوالجلال والاکرام کی عظمت و کبریائی کا احساس و شعور رہتا ہے نہ اس کی صفاتِ رحمت و ربوبیّت کا۔ چنانچہ وہ غیر اللہ کو اپنا حاجت روا سمجھ کر اس سے مرادیں مانگتا اور مدد کے لیے اُسے پکارتا ہے اور اس شرک کے سبب وہ انسانیت کے اعلیٰ و ارفع مقام سے پھسل کر ذلّت و رزالت کے تحت الثریٰ میں جا گرتا ہے اور اصطلاحِ قرآنی میں اسفل سافلین بن جاتا ہے۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ آذر بندگانِ خدا کو اپنے بندے بنانے اور بنائے رکھنے، نیز انھیں دھوکے میں مبتلا رکھنے کی خاطر غیر اللہ کو تاویل باباطل اور تسمیہ باباطل کے ذریعے خدائی صفات سے منسوب کر کے انہیں مافوق البشر بنا دیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں سادہ دل و تقلید پسند لوگ ان کی باتوں کو باور کر لیتے ہیں اور شرک کا بازار گرم رہتا ہے۔

۳۔ **خوف** : یہ نظریہ کہ دنیا میں شرک کی شروعات خوف سے ہوئی، اس اعتبار سے سچا ہے کہ خوف نے انسان کو مشرک بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے اور کر رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مظاہرِ فطرت اور اجرام فلکی کے جلال و جبروت، بعض

جانوروں مثلاً ناگ کی ہیبت، نیز ساحروں کے سحر، اکابر اور تارک الدنیا درویشوں، فقیروں، جوگیوں، سنیاسیوں، کاہنوں، پیروں، مجاوروں، سجادہ نشینوں، ملنگوں، قلندروں وغیرہ وغیرہ کی مزعومہ مافوق الفطرت قوتوں سے مرعوب ہو کر انسان ان کی پرستش کرنے لگا۔ لوگوں میں شرک پھیلا تو ان میں آذر پیدا ہو گئے۔ انہوں نے جلبِ منفعت و قوت اور لوگوں کا استحصال کرنے کی خاطر تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے طاغوتی فنون ایجاد کیے اور ان کے ذریعے شرک و بت پرستی کو عبادت اور دین کے اجزائے لاینفک بنا دیا۔

غیر اللہ تو انسان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، بجز مشیتِ الٰہی کے، لیکن غیر اللہ کا خوف انسان کے عقیدۂ توحید، تقویٰ و توکل، نیز ان کے جمالیاتی ارتقا کو سخت نقصان پہنچاتا ہے۔ علاوہ بریں، یہ خوفِ باطل انسان کو باطل پرست، مشرک اور بت پرست بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ بار بار انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی مشیتِ الٰہی کے بغیر کسی کو نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے: "اور (ظالم و مجرم) اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں۔ ان سے کہو، کیا تم اللہ کو ایسی بات کی خبر دیتے ہو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟ وہ پاک و منزہ اور بالا و برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ابتداء میں سب بنی نوعِ انسان ایک ہی امت تھے، بعد میں انہوں نے اختلاف کیا (اور مختلف عقیدے اور فرقے بنا لیے)، اور اگر ایک بات تیرے رب کی طرف سے پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو جس بات میں وہ اختلاف کرتے ہیں، اس کا فیصلہ کر دیا جاتا"

(یونس ۱۰: ۱۸-۱۹)۔

محولۂ بالا آیاتِ جلیلہ کے مضمرات شرک کے اعتبار سے ازبس اہم ہیں۔ ربِّ

ذوالجلال والاکرام نے انسان کو غیراللہ کے موہومہ خوف سے نجات دلانے کی خاطر اسے اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا انسان لاکھ کسی کی پرستش و بندگی کرے لاحاصل ہے، اس لیے کہ کسی ہستی میں دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں ؛ لہٰذا کسی سے خوف کھانا یا کوئی اُمید رکھنا عبث ہے۔ساتھ ہی اس عقیدۂ شفاعت کی بھی تردید کر دی گئی ہے کہ ان کے معبودانِ باطلہ اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی سفارش کر سکتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ اس قدر عظیم و کبیر، جلیل و متعال، عزیز و قدیر، جبّار و قہّار اور سبحان و صمد ہے اور ہر شے اور ہستی اس کی مخلوق در پردہ، محتاج وسائل اور عاجز و درماندہ ہے، لہٰذا اس کے سامنے نہ تو دم مار سکتی ہے اور نہ اس کے حضور سفارش ہی کر سکتی ہے۔اس سے ثابت ہوا کہ غیراللہ سے ڈرنا کہ وہ کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے یا اس سے امید رکھنا کہ وہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے، عبث و لایعنی بھی ہے اور جہل و شرک بھی۔

۴۔ رجا یا امید : شرک کا چوتھا محرّک و عامل غیراللہ کو اپنا حاجت روا و کارساز سمجھ کر اس سے امیدیں وابستہ کرنا ہے۔ہر دین میں ان لوگوں کی اکثریت ہے جو مذہبی پیشواؤں، پیروں، فقیروں، درویشوں، راہبوں، مجذوبوں، جوگیوں، مجاوروں وغیرہ وغیرہ کے آستانوں اور ان کے مزاروں پر جاتے اور ان کے سامنے اپنی معروضات و حاجات پیش کرتے ہیں کیونکہ ان کو اُمید ہوتی ہے کہ ان "مافوق البشر ہستیوں" میں حاجات کو پورا کرنے اور مرادیں برلانے کی قدرت ہوتی ہے ؛ نیز وہ ان کو نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہیں۔کیا یہ عقیدہ و فعل جسے وہ عبادت سمجھ کر کرتے ہیں، غیراللہ کو خدا ماننا نہیں ؟ اگر ہے اور یقیناً ہے کہ اس پر قرآنِ مجید شاہد ہے تو پھر یہ شرک ہوا، جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں ظلمِ عظیم اور گناہِ کبیرہ ہے۔اس سلسلے میں علاّمہ اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے :

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نو امیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے ؟

اب اس حقیقت کے ثبوت میں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جملہ ہستیاں، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کے نبیؑ اور رسولؐ ہی کیوں نہ ہوں، نہ تو اپنے آپ کو اور نہ کسی اور ہی کو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتی ہیں، چند آیاتِ جلیلہ پیش کی جاتی ہیں :

۱۔ (اے پیغمبرِ اعظم و آخرؐ :) کہہ دیجیے کہ میں اپنے لیے نقصان اور نفع کا مالک نہیں ہوں ؛ یعنی اپنے آپ کو نقصان اور نفع پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا ہوں (یونس ۱۰ : ۴۹) ۔ یہ دراصل ہر نبیؑ اور رسولؐ کا اعترافِ حقیقت ہے، جو مشرکوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے ۔ چونکہ غیراللہ کی عبادت ایک عبث و لایعنی فعل بھی ہے اور شرک بھی، جو ظلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ ہے (النسآء ۴ : ۴۸)، لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے توحید اور اس کی ضد و نقیض شرک کی حقیقت کو اس طرح بیان کرتا ہے :

۲۔ (اے نبیؑ) کہہ دو : "اے لوگو! اگر تمہیں میرے دین (توحید) میں شک و شبہ ہے تو سُن لو کہ تم اللہ کے سوا جن ہستیوں کی عبادت (پرستش و بندگی) کرتے ہو، میں ان کی عبادت نہیں کرتا (اس لیے کہ یہ شرک ہے) ؛ لیکن میں (صرف) اللہ کی عبادت کرتا ہوں، جو تمہیں وفات دیتا ہے (یعنی جس کے قبضے میں تمہاری زندگی و موت ہے)، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مؤمنوں یعنی سچے موحّدوں کے زمرے میں رہوں ۔ اور مجھے فرمایا گیا ہے کہ تو ہر طرف سے ہٹ کر اپنا رُخ اللہ کے دین کی طرف کر لے اور اس پر قائم رہ، اور ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو جانا ۔ (اس لیے کہ غیراللہ کی طرف رجوع کرنا شرک ہے)، اور اللہ کے سوا کسی کو نہ پکار ۔ (اس لیے کہ) اس کے سوا کوئی بھی ہو ، وہ نہ تو فائدہ پہنچا سکتا

ہے نہ نقصان۔ اگر تو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہو جائے گا۔ اگر اللہ تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے سوا اس کو دور کرنے والا کوئی نہیں؛ اور اگر وہ تیرے حق میں کسی خیر و خوبی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو ردّ کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس پہ چاہے، اپنا فضل کر دے۔ وہ بخشنے اور رحم کرنے والا ہے (یونس ۱۰: ۱۰۴ تا ۱۰۷)۔

۳۔ متذکرۂ بالا دلیل شرک کے ردّ اور توحید کے اثبات میں بُرہانِ قاطع کی حیثیت رکھتی ہے۔ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو یہی دلیل دی تھی۔ چنانچہ آپؑ نے اپنی قوم کو فرمایا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کرتے ہو، جو نہ تو تمہیں نفع پہنچانے کی قدرت رکھتی ہیں نہ نقصان کی۔ تُف ہے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو۔ کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ؟ (الانبیآء ۲۱: ۶۶-۶۷)۔

۴۔ قرآنِ حکیم نے دین کا اصل الاصول یہ بتایا ہے کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی حمد و ثنا اور پرستش و بندگی یا عبادت کا حق دار ہے، اس لیے کہ وہ بشمولِ انسان کُل کائنات کا خالق و ربّ اور اِلٰہ ہے۔ علاوہ بریں، اُس نے نہ صرف انسان کو پیدا کیا ہے، بلکہ اس کے عرصۂ حیات میں وسعت و کشادگی پیدا کرنے، اس کو محبّت و شفقت اور مسرّت و طمانیت سے معمور کرنے، نیز انسان کے اعزّہ و اقارب مونس و غمخوار، ہمدرد و جاں نثار اور محسن و چارہ ساز بنانے کی خاطر اس کو ددھیالی، ننھیالی اور سسرالی رشتوں میں منسلک کر دیا ہے۔ ظاہر ہے ایسے ربّ رحمان و رحیم کو چھوڑ کر ایسی ہستیوں کی پرستش و بندگی کرنا، جو نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت نہ رکھتی ہوں، کفر اور ظلمِ عظیم نہیں تو اور کیا ہے ؟ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے: "اور وہی ہے جس نے پانی سے بشر کو پیدا کیا، پھر اس کے لیے نسب و سسرال کے رشتے

قائم کیے۔ تیرا ربّ بڑا ہی قدرت والا ہے۔ ایسے اللہ کو چھوڑ کر لوگ ان کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ مزید برآں، کافر اپنے ربّ کے خلاف دوسروں کا مددگار بنتا ہے (الفرقان ۲۵: ۴۵ تا ۵۵)۔

۵۔ شرک کے خلاف قرآنِ مجید ایک دلیل یہ دیتا ہے کہ مشرک جن ہستیوں کی پرستش کرتے ہیں وہ تو اپنے آپ کو بھی نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتیں، دوسروں کو کیا اور کیسے فائدہ یا نقصان پہنچا سکتی ہیں؟ جب یہ حقیقت ہے تو پھر ان کی عبادت کرنا ظلم و جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اُن سے پوچھو! آسمانوں اور زمین کا ربّ کون ہے؟ کہو، اللہ ہے (اس کے سوا کوئی نہیں)۔ پھر اُن سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ تم نے اس کے سوا دوسروں کو اپنے اولیاء یا دوست و کارساز بنا رکھا ہے جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے؟ کہو! کیا اندھا اور دیکھنے والا، دونوں برابر ہیں؟ یا ایسا ہو سکتا ہے کہ اندھیرا اور اُجالا برابر ہو جائیں؟ اور اگر ایسا نہیں تو کیا ان کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں نے بھی اسی طرح مخلوقات پیدا کی، جس طرح اللہ نے پیدا کی ہے کہ اس کی وجہ سے ان پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا؟ کہو! ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہی ہے، اور وہ یکتا ہے، سب پر غالب (الرّعد ۱۳: ۱۶)۔

۶۔ یوں تو قرآنِ مجید کی ہر دلیل ہی برہانِ قاطع اور بصیرت افروز ہوتی ہے لیکن اب ایک ایسی منفرد انداز کی دلیل نقل کی جاتی ہے، جس پر انسان خلوصِ دل سے غور و خوض کرے تو کبھی شرک نہ کرے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اسی کو پکارنا حق (یعنی افادیت و مقصدیت اور سچائی رکھتا) ہے۔ رہے

لوگ اس کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں، وہ پکارنے والوں کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ انہیں پکارنا تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص پانی کی طرف ہاتھ پھیلا کر اس سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا، حالانکہ پانی اس تک پہنچنے والا نہیں، اور کافروں کی دعائیں اکارت ہی جاتی ہیں (الرّعد ۱۳: ۱۴)۔

دین کی اساس اگر توحید ہے تو شرک اس کا استیصال ہے، لہٰذا یہ ناقابلِ معافی جرم و گناہ ہے اور اس کا اعلان اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں واشگاف الفاظ میں کر دیا ہے:

۱۔ اللہ بس شرک ہی کو نہیں بخشتا، اس کے سوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جو کسی اور کو شریک ٹھیراتا ہے، وہ یقیناً بہت بڑا گناہ کرتا ہوا (اللہ پر) افترا پردازی کرتا ہے (النسآء ۴: ۴۸)۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر شرک ناقابلِ عفو گناہ ہے تو مشرک حد سے زیادہ گمراہ ہے،

۲۔ اللہ یہ بات بخشنے والا نہیں کہ اس کے ساتھ کسی کو ٹھیرایا جائے۔ اس کے سوا دوسرے جتنے گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے، بخش دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جو کسی اور کو شریک ٹھیراتا ہے وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا (النسآء ۴: ۱۱۶)۔

۳۔ شرک ایسا ظلمِ عظیم ہے کہ جو ایسا کرتا ہے اس پر جنّت حرام ہو جاتی ہے اور اسے جہنّم میں رہنا پڑتا ہے:

"بلاشبہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیراتا ہے، اللہ نے اس پر جنّت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مدد گار نہیں

(المائدۃ ۵: ۷۲)۔

۴۔ عیسائیوں میں شرک کی ابتدا، عقیدۂ اِبنیت سے ہوئی، یعنی اس عقیدے سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (توبہ نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں۔ یہ عقیدہ مجاز کو اصل قرار دینے کی بڑی ہی عبرت انگیز مثال ہے۔ اس سے اہلِ کلیسا نے تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے ذریعے تثلیث یا اقانیم ثلاثہ کا عقیدہ پیدا کر لیا۔ اس سے ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، روح القدس اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تینوں مل کر ایک ہیں۔ ایک میں تین اور تین میں ایک کا عقیدہ جسے تثلیث کہتے ہیں، خود عیسائیوں کے لیے ناقابلِ فہم و اِدراک مُعمّا اور لاینحل مسئلہ ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اس عقیدے کو ایمان کی اساس اور جنّت میں جانے کی پیش شرط سمجھتے ہیں۔ اسی سے اُلوہیتِ عیسیٰؑ کا عقیدہ نکلا اور مقبول ہوا۔ تاریخ کا المیّہ یہ ہے کہ اسلام جو ان اور اس سے ملتے جلتے مشرکانہ عقائد کا استیصال کرنے کے لیے آیا تھا، اس میں بھی ایسے فرقے پیدا ہو گئے، جو اپنے اپنے بزرگوں کو صفاتِ الٰہیہ سے متصّف کر کے انہیں خالق و ربّ یا خدا سمجھتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ان کی حمد و ثنا اور پرستش خدا کی طرح کرتے ہیں؛ ان کو اپنی مدد کے لیے خدا کی طرح پکارتے اور ان سے مرادیں مانگتے اور ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں۔ یہ سب مشرکانہ عقائد ہیں، جو مختلف شکلیں اختیار کر کے اقوامِ عالم میں مروّج ہیں اور دین کے عناصرِ لاینفک بن چکے ہیں قرآنِ مجید نے ان عقائدِ باطلہ کی تردید اس طرح کی ہے:

"یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا: اللہ تین میں کا ایک ہے (یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس)، حالانکہ ایک خدا یا معبود کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر ایسے سب

لوگ ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کو دردناک عذاب دیا جائے گا" (المآئدۃ ۵: ۷۳)۔

یہ بڑی ہی فکر انگیز و عبرتناک حقیقت اور انسان کے ظالم و جاہل ہونے کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو یہ فرمائیں کہ "مشرک پر جنّت حرام کر دی گئی ہے" (المآئدۃ ۵: ۷۲)، لیکن آپؑ ہی کے اُمّتی آپ کو خدا کا بیٹا اور خدا سمجھیں اور اس عقیدے کو جنّت میں جانے کی پیش شرط قرار دیں۔ یہ آیتِ جلیلہ مسلمانوں کے ان فرقوں کے لیے بھی عبرت کا تازیانہ ہے، جو اپنے اپنے اکابر، اولیآء اللہ، آئمۂ کرام کو اپنا اِلٰہ و ربّ یا خدا سمجھتے ہیں اور اس عقیدے کو کلیدِ جنّت خیال کرتے ہیں۔

۵۔ قرآنِ مجید کی یہ دلیل بھی شرک کے خلاف برہانِ قاطع ہے کہ جب یہ حقیقت ہے، جسے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے مانتے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی بحر و بر میں پیش آنے والے خطرات و مصائب اور شدائد و آلام، نیز ہر کرب و الم سے نجات دیتا ہے تو پھر شرک کرنے یعنی اس کے سوا کسی اور کو اپنا نجات دہندہ، مشکل کشا، وکیل، نصیر اور دستگیر و حاجت روا سمجھنے کی وجہِ جواز تو کوئی نہ ہوئی۔ اس پر بھی اگر کوئی انسان شرک کرتا ہے تو پھر اس کے ظالم و جاہل اور اہلِ نار ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہوتا ہے:

"اے پیغمبرؐ! ان سے پوچھو! وہ کون ہے جو تمہیں خشکی اور سمندر کے اندھیروں کی مشکلات و خطرات سے نجات دیتا ہے؟ کون ہے وہ جس سے تم (مصیبت کے وقت) آہ و زاری کرتے اور چپکے چپکے دُعائیں مانگتے ہو؟ کس سے کہتے ہو کہ اگر اس کرب و بلا سے تم نے ہمیں بچا لیا تو ہم یقیناً شکر گزار بندے بن کر رہیں گے؟ کہو: اللہ ہی تمہیں (ان مصائب و خطرات) سے اور ہر طرح کے کرب و الم سے نجات دیتا ہے، لیکن اس پر بھی تم اس کے ساتھ شریک

ٹھیراتے ہو۔" (الانعام ۶ : ۶۳ - ۶۴)۔

شرک سے متعلق اللہ تعالیٰ نے ایک ازبس عبرت انگیز و بصیرت افروز مثال دی ہے، ارشاد ہوتا ہے :

"ہر قسم کے بتوں کی گندگی سے بچو (بت پرستی و شرک انتہائی پلید کام ہے، نیز) جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو (صرف اللہ ہی کے لیے ہو کر رہو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک ٹھیرائے تو گویا وہ اچانک بلندی سے نیچے گر پڑا۔ (ظاہر ہے جو چیز اس طرح نیچے گرے گی تو) اُسے پرندے اُچک لے جائیں گے یا ہوا اُسے اڑا کر ایسی جگہ پھینک دے گی جہاں اس کے پرزے اڑ جائیں گے (الحج ۲۲ : ۳۰ - ۳۱)۔

اس آیتِ جلیلہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ شرک کرنے سے ایک تو انسان حسن و نور سے محروم ہو کر پلید و ناپاک ہو جاتا ہے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا : اے مسلمانو! مشرک یقیناً نجس ہیں (التوبۃ ۹ : ۲۸)۔ دوسرے شرک کی بات جھوٹ اور باطل ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شرک تاویل باطل اور تسمیہ باطل کا نتیجہ ہے، لہٰذا یہ بے بنیاد ہوتا ہے۔ تیسرے، شرک سے انسان مقام انسانیت سے پھسل کر ایسی جگہ گرتا ہے اور اس طرح گرتا ہے کہ اس کی ذات ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ یا تو مردار خور گدھوں کی نذر ہو جاتا ہے یا بادِ حرص و ہوا اسے برباد کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں شرک کرنے والے چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، بدترین خلائق ہیں اور ان کا انجام بڑا ہی بھیانک اور عبرتناک ہے، اس لیے کہ وہ مرنے کے بعد ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کافروں اور مشرکوں سے متعلق فرماتا ہے :

"اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اور شرک بھی، جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی لوگ بدترین خلائق ہیں (البیّنۃ ۹۸ : ۷)۔ دوسری جگہ عذاب النار کی

کیفیت یہ بتائی ہے کہ اہلِ نار کو وہاں نہ موت آئے گی اور نہ وہ لذّتِ زندگی سے آشنا ہی ہوں گے (الاعلیٰ ۸۷ : ۱۳)۔

قرآنِ مجید کی رُو سے بدترین خلائق اگر کافر و مُشرک ہیں تو بہترین خلائق مؤمن و صالح لوگ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مُشرک کا ایمان معتبر ہے نہ عبادت، لہٰذا وہ مؤمن ہوتا ہے نہ صالح۔ انسان کا یہ ظلم و جہل بھی ہے اور شیطان کے جمالیاتی فریب کا کرشمہ بھی کہ اُمّتِ مُسلمہ سمیت ہر قوم و دین میں مشرک لوگ اپنے آپ کو مؤمن و صالح اور زاہد و عابد سمجھتے ہیں اور اس دھوکے میں مارے جاتے ہیں، اس لیے کہ انھیں نہ توبہ کی توفیق ہی ہوتی ہے اور نہ وہ اپنی اصلاح ہی کر سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ مُشرک اپنے شرک کی وجہ سے سُنّدر سرشت اور اہلِ نار ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اسے جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہنا پڑے گا، اس لیے کہ شرک ایسا سرطانی مرض ہے جس کا علاج نہیں "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کی مثال شرک پر صادق آتی ہے۔ علاوہ بریں، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں قرآنِ حکیم کا یہ فتویٰ ہے کہ شرک ناقابلِ معافی گناہ ہے اور مشرک پر جنّت حرام ہے۔ بخلاف اس کے مؤمن و صالح لوگ اس دنیا میں بھی اہلِ حسن و سُرور ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی وہ جنّت میں ایسے ہی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن سے خوش اور وہ اللہ تعالیٰ سے خوش۔ یہ صلہ اُسے ملتا ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے (البیّنۃ ۹۸ : ۸)۔

اس سے کئی نتائج کا استنباط کر سکتے ہیں، اوّل مُشرک متقی نہیں ہوتا، اور وہ اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا، بلکہ غیر اللہ سے ڈرتا ہے۔ وہ دراصل اپنے جرم و گناہ کے انجام سے ڈرتا ہے اور مکافاتِ عمل سے بچنے کی خاطر مردہ و زندہ ہستیوں کو خدائی صفات کا حامل سمجھ کر ان کا سہارا ڈھونڈتا ہے، اور ان کو خوش کرنے اور اپنا دالی و کارساز بنانے کی خاطر ان کی پرستش کرتا ہے اور ان کی وفات کے بعد ان کے قبروں، آستانوں، شبیہوں، مورتیوں اور مجسموں کو پوجتا اور ان پر چڑھاوے چڑھاتا ہے ظُلم و جہل کی انتہا یہ ہے کہ

اس بت پرستی و شرک کو وہ عبادت و کارِ ثواب سمجھتا اور اس پر فخر کرتا ہے، نیز موحدین کو بُرے ناموں سے موسوم کرتا، ان کا مذاق اڑاتا اور طعن و تشنیع کا ہدف بناتا ہے۔

الغرض، جس معاشرے میں شرک (بت پرستی) وجہِ افتخار ہو جائے، اس کی اصلاح کی ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے "حسنِ انقلاب" کے ذریعے آزروں، ان کے آستانوں اور ان کے سرپرست معاشرتی سرطانوں کا استیصال۔

قرآنِ مجید نے حیاتِ انسانی کا ایک ایسا عالمگیر و احسن اور سچا اصول بتایا ہے، جو حق کی طلب و جستجو رکھنے والوں کے لیے قابلِ قبول بننے کی قابلیت رکھتا ہے۔ اس اصول کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں: انسان اس دُنیا میں جیسی زندگی (طیب و حسین یا خبیث و قبیح) گزارتا ہے، آخرت میں اُسے ویسی ہی زندگی ملتی ہے (الرعد ۱۳: ۲۹)۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: "جو لوگ اس دُنیا میں طیب زندگی گزارتے ہیں، انھیں آخرت میں بھی جنت کی ابدی زندگی ملتی ہے (النحل ۱۶: ۳۲) حیاتِ طیبہ قرآنِ حکیم کی جامع و مانع اصطلاح ہے، جس کا مطلب ہے شرک و سیئہ اور خوف و حزن پاک و صاف، نیز حسین و مُطہر اور مطمئن و خوشحال زندگی۔ محوّلۂ بالا آیات جلیلہ سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ جنت میں فقط وہی مؤمن و صالح لوگ جائیں گے جو شرک کی نجاستوں سے پاک و صاف ہوں گے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ شرک نجاست، ظلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ ہے، اور مُشرک نجس (ناپاک)، ظالم و جاہل اور گناہگار و اہلِ نار ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ضمنی نتیجہ نکلا کہ وہ نہ تو مؤمن و موحّد ہوتے ہیں اور نہ متقی و صالح۔ علاوہ بریں عقلِ سلیم کا تقاضا ہے کہ ہمیں دُنیا میں خوف و حزن کی تاریک و سوزاں، نیز نجس و قبیح زندگی اور آخرت میں بھی ایسی نار بداماں زندگی، نیز عذابِ جہنم سے بچنے کی خاطر چھوٹے سے چھوٹے اور خفی سے خفی شرک سے بھی گریزاں و ترساں رہنا چاہیے۔

اصل یہ ہے کہ توحید اور شرک ایک دوسرے کی ضد و نقیض ہیں اور توحید اصلِ ایمان و دین ہے، لہٰذا ہزار دعووں کے باوجود مشرک نہ تو مؤمن ہوتا ہے نہ موحّد، بلکہ وہ صالح و محسن بھی نہیں ہوتا۔ وہ شر الدّواب ہوتا ہے۔

دین کی حقیقت توحید ہے اور توحید حسن و حق ہے اور اس کی ضد و نقیض شرک ہے، جو قبیح و باطل ہے۔ شرک غارتگرِ دین و ایمان اور رہزنِ حُسن و حق ہے نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ نفس کا سرطان یا کینسر ہے، جو اُسے اس کی فطری قوت و توانائی اور حسن و زندگی سے محروم کر کے اس کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مشرک کے تزکیۂ نفس اور جمالیاتی ارتقاء کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں، تاوقتیکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور توبۃ النصوح کر کے شرک سے باز نہیں آجاتا اور موحّد نہیں بن جاتا۔ بالفاظِ دیگر، وہ اللہ تعالیٰ کے سوا سب معبودوں سے منہ موڑ کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا نہیں ہو جاتا اور اسے اپنا قولاً و فعلاً إلٰہ و ربّ نہیں بنا لیتا۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسان کی زندگی میں عقیدۂ توحید خون کی طرح جذب نہیں ہو جاتا، وہ مؤمن نہیں ہوتا۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہوتی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ بار بار انسان کو طرح طرح کے دلائل و براہین کے ذریعے شرک کی نفی اور توحید کا اثبات کرتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

(اے بنی نوع انسان! غور تو کرو) کیا جو پیدا کرتا ہے (یعنی خالق بھی ہے اور رازق و نشو و نما دینے والا مالک بھی) اس جیسا ہے جو خود کچھ پیدا نہیں کرتا (بلکہ اپنے خالق و ربّ کا پروردہ و محتاج ہے)؟ تم کیوں سمجھتے بوجھتے نہیں؟ (تم سوچتے سمجھتے کیوں نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا مُنعم و محسن اور وہّاب و جواد ہے کہ) اگر تم اللہ کی نعمتیں گننی چاہو تو وہ اتنی زیادہ ہے کہ گن نہ سکو۔ بلاشبہ اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور بڑا ہی رحم کرنے والا ہے، اور یہ نہ بھولو کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے جو کچھ

تم چھپاتے ہو اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو۔ کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں۔ اور اللہ کے سوا جن ہستیوں کو (چاہے وہ کتنی برگزیدہ کیوں نہ ہوں) یہ (مشرک لوگ) پکارتے ہیں ان کا تو یہ حال ہے کہ وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتیں، بلکہ خود مخلوق ہیں۔ وہ مردہ ہیں زندہ نہیں۔ اور ان کو کچھ معلوم نہیں کہ انہیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا۔ (حق یہ ہے کہ) تمہارا معبود یا خدا ایک ہی معبود یا خدا ہے۔ چنانچہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے دلوں میں انکار بس کر رہ گیا ہے، اور وہ تکبر کرتے ہیں (النحل ۱۶: ۷ تا ۲۲)۔

ان آیاتِ جلیلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو حقائق بیان کیے ہیں، ان کو سمجھنے اور اجزائے ایمان و زندگی بنانے کی خاطر انسان کو دعوتِ تفکر و تعقل دی ہے۔ دل میں آرزوئے حق ہو اور سچی ہو، نیت میں اخلاص ہو، یعنی تلب ہر قسم کی عصبیت، مثلاً دینی، مذہبی، قومی، فکری اور ثقافتی تعصبات سے پاک و صاف ہو اور عقل بھی سلیم ہو تو پھر انسان غور کرے تو ان معقول و فطری اور غیر مبہم حقائق کو تسلیم کیے اور انہیں اجزائے ایمان و زندگی بنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ چونکہ یہ حقائق دین کی اساس ہیں اور ان پر انسان کی دُنیوی و اُخروی حسنہ و فلاح اور کامیابی کا، نیز خوف و حزن سے مصونیت کا دارو مدار ہے، اس لیے ان پر نظرِ مکرّر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے۔

اوّل، "خالق و مخلوق برابر نہیں ہو سکتے"۔ جب یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے تو پھر کسی مخلوق کو اپنا اِلٰہ و ربّ سمجھنے اور بنانے سے بڑھ کر ظلم و جہل اور کیا ہو سکتا ہے؟ اگر یہ شرک نہیں تو پھر شرک کسے کہتے ہیں؟ اُمّتِ مسلمہ سمیت ہر قوم کے مشرکین صاف شرک کرتے ہیں، لیکن شرک کو ظلمِ عظیم سمجھنے کے بجائے اسے عبادت سمجھ کر کرتے اور اپنے آپ کو موحّد کہتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں انسان کو ظلوم و جہول کہنے کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہے۔

دوم، جب ربّ ذوالجلال والاکرام سے بڑھ کر اس کا کوئی بندہ (اور ہر بندہ اس کا محتاج و دست نگر اور اس کا سائل و گدا ہے) منعم و وہاب اور معطی و محسن اور جواد و کریم نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہی ہے تو پھر اس کو چھوڑ کر اس کے کسی بندے سے جو اس کا محتاج ہے، مانگنا، اللہ تعالیٰ کی قدر ناشناسی، انسانیت کی تذلیل، خودی کی تحقیر اور سفاہت و ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟

سوم، عالم الغیب صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہے، لہٰذا اس کے سوا کوئی عالم الغیب اور خدا ہو نہیں سکتا۔

چوتھے، ہر انسان جو فوت ہو جاتا ہے، وہ زندوں کی طرح نہیں ہوتا، بلکہ مردہ ہوتا ہے اور اُسے اس بات کا قطعاً شعور یا علم نہیں ہوتا کہ وہ کب خوابِ مرگ سے بیدار کیا جائے گا؟

بات سوچنے کی ہے کہ جس ہستی کو مرنے کے بعد اس اپنی زندگی و موت کا شعور نہ ہو وہ کیسے عالم الغیب ہو سکتا ہے؟ وہ کیسے دوسروں کی فریاد و پکار کو سن سکتا اور ان کی مدد کر سکتا ہے؟ علاوہ بریں، جو خود اپنے ربّ ذوالجلال والاکرام کا محتاج و دست نگر ہو، اور وہ دوسروں کا حاجت روا و کارساز، داتا، دستگیر اور مستجیب الدعوات کیسے ہو سکتا ہے؟ جو شخص زندگی میں دو چار اشخاص کی آوازیں بیک وقت سن نہ سکتا ہو، وہ مرنے کے بعد ہزاروں، لاکھوں انسانوں کی دعا و فریاد کو بیک وقت کیسے سُن سکتا اور ان کی فریاد رسی و حاجت روائی کر سکتا ہے؟ موت ہر یا شہادت وہ مومن و شہید کو "خدا" تو نہیں بنا دیتی۔ آذر تسمیہ باطل و تاویل بالباطل کے فن کے ذریعے اپنے مریدوں، مقتدیوں، عقیدت مندوں اور شرک پسند لوگوں کو یہ باور کرا دیتے ہیں کہ اولیاء اللہ وفات کے بعد "خدائی صفات" سے متصف اور کاروبارِ خدائی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں خدا تعالیٰ کی طرح (نعوذ باللہ

وحاکم ہو ہیں) سمیع و بصیر، عزیز و قدیر، کارساز و حاجت روا، حاضر و ناظر، حافظ و ناصر، علیم و خبیر، حی و قیوم اور مستجیب الدعوات بن جاتے ہیں۔ اس بات کی تصدیق آذروں کے آستانوں، کتابوں، رسالوں، مزاروں اور ان کے عرس اور رسموں سے ہوتی ہے۔ چونکہ شرک کی بنیاد علم و حکمت پر نہیں ہوتی، محض ظن و وہم اور ظلم و جہل پر ہوتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ انسان کو کورانہ تقلید سے منع کرتا اور اپنے حواس و عقل سے کام لینے کا حکم دیتا ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝ (الاسراء ۱۷: ۳۶)؛ جس بات کا تجھے علم نہیں، اُس کے پیچھے نہ لگ (بلکہ ہوش و حواس و عقل سے کام لو اور یاد رکھو) کان، آنکھ اور دل و دماغ سب ہی کی بازپرس ہونی ہے۔

مُشرکوں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آذروں کی بے جانے بوجھے اور بے سوچے سمجھے پیروی کرتے، ان کی ہر بات پر نامِ خدا کہتے اور اُسے حرفِ آخر مانتے ہیں۔ چنانچہ اوّل تو وہ اپنے آذروں کے علاوہ کسی اور کی بات سنتے ہی نہیں، اگر بیدلی سے ایک کان سے سنتے بھی ہیں تو دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں اور شرک کی کثافتوں کے سبب توحید کی بات ان کے دلوں میں اُترتی ہی نہیں۔ مُشرکوں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مجلسوں میں بڑے ذوق و شوق سے اپنے اپنے بزرگوں کا ذکر کرتے، ان کی حمد و ثنا کرتے، ان کے قصیدے پڑھتے، ان کی کرامات اور قصّے کہانیاں بیان کرتے اور خوش ہوتے ہیں، نیز اسے عبادت سمجھتے ہیں، لیکن جب توحید یعنی اکیلے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو انھیں سخت ناگوار گزرتا ہے اور وہ منہ موڑ کر کھسک جاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ شرک کے سبب ان کی عقلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں، اسکے نتیجے میں وہ کچھ سمجھتے نہیں، نیز ان کے کان اس قدر بوجھل ہو جاتے ہیں کہ وہ

حق و صداقت کی بات سننے کے متحمل ہی نہیں ہو سکتے۔ شرک کے یہ منفی اثرات جو رہزنِ تمکین و ہوش اور غارتگرِ ایمان و آگہی ہیں، قرآنِ مجید نے اپنے اعجازِ بلاغت سے اس طرح بیان کیے ہیں: "اُن (مشرکوں) کی عقلوں پہ ایسا پردہ ڈال دیتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دیتے ہیں؛ اور جب تم قرآن میں ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ موڑ لیتے ہیں (الاسرا، ۱۷:۴۶)۔

مُشرکوں کے ظُلم و جہل کی اِنتہا یہ ہے کہ وہ ایک طرف اپنے معبودوں کے ذکر سے خوش ہوتے اور اسے عبادت سمجھتے ہیں اور دوسری جانب "تنہا ذکرِ الٰہی" ان پر اس قدر شاق گزرتا ہے کہ وہ اسے سُن بھی نہیں سکتے اور بیزاری سے منہ موڑ لیتے ہیں، اور اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو مُؤمن و موحّد سمجھتے ہیں۔ حکمت کی یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ اگر انسان بدی کو بدی، شر کو شر، گناہ کو گناہ، ظلم کو ظلم اور جرم کو جرم ہی نہ سمجھے تو اس کے دل میں نہ اپنی اِصلاح کی آرزو پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ مُشرکوں کی اصلاح تو اس لیے بھی محال ہے کہ وہ "سحرِ آزری" اور "طلسمِ سامری" کے سبب شرک کو ظُلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ سمجھنے کے بجائے عبادت سمجھ کر کرتے اور اپنے آپ کو "اہلِ عشق" خیال کرتے ہیں۔ چونکہ شرک کے ہیولے میں معاشرتی سرطانیت کی صورتیں مضمر ہوتی ہیں، اس لیے معاشرتی سرطان (فرعون، ہامان اور قارون وغیرہ) اپنی بقا، سلامتی، حکومت و سیادت، اقتدار و وقار اور قیادت و جلبِ منفعت کی خاطر شرک کی تبلیغ کرنے اور اسے فروغ دینے میں کوشاں رہتے ہیں۔ طوائفوں کی اس کہاوت کے تتبّع میں کہ "پیشتر اس کے کہ دوسرا تمہارے عیوب کا تمہیں طعنہ دے، تم اپنے عیوب سے اُسے مطعون کر دو"، آئمۂ مشرکین بھی موحّدین پر یہ الزام دھرتے اور ان پہ بہتان باندھتے ہیں کہ وہ بزرگوں، اولیآء اللہ اور برگزیدہ ہستیوں کو نہیں مانتے اور ان کی شان میں گستاخی و بے ادبی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی جو نفسیاتی کیفیت سورۂ بنی اسرائیل کی محولۂ بالا آیات میں بیان کی ہے، لفظی تغیّر کے ساتھ سورۂ زمر میں اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ...... يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ (الزمر ۳۹ : ۴۵) : اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے اور نفرت کرنے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یک لخت خوش ہو جاتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں تدبّر بالحق کرنے سے اس حقیقت سے آگاہی ہوتی ہے کہ توحید میں ایمان بالآخرۃ اور شرک میں انکارِ آخرت مضمر ہے، اگرچہ مشرکین کو اپنی اس نفسیاتی کیفیت کا شعور نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک ظلم و جہل ہے، جس کے سبب مشرکوں کے حسّی، قلبی، نفسی نظام کا نور سلب ہو جاتا اور توازن بگڑ جاتا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ نورِ باطنی ہے جو وجہِ شرفِ انسانی اور اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے؛ نیز اس کے ارتقاء و اتمام ہی میں انسان کے ترفّعِ درجات کا راز مضمر ہے، اس دُنیا اور آخرت دونوں میں۔ اس نورِ باطنی کے ارتقاء کے لیے ہم نے "جمالیاتی ارتقاء" کی تعبیر اختیار کی ہے۔ جمالیاتی ارتقاء ہی حقیقت میں ارتقائے انسانی ہے اور اس کا سلسلہ لامتناہی ہے؛ نیز اس میں بوقلمونی و دلکشیِ حیات اور جمالیاتی ذوق کی گوناگونی و پہنائی اور اس کی تسکین کا راز مضمر ہے۔

یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ اصل یہ ہے کہ شرک میں توحید کے ساتھ آخرت کا انکار بھی مضمر ہوتا ہے۔ محولۂ بالا آیات سے مندرجۂ ذیل نتائج کا استنباط کر سکتے ہیں:

ایک، یہ کہ مشرکوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی نہیں، اپنے معبودوں کی محبت ہوتی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ انسان کے سینے میں دو نہیں ایک ہی دل ہوتا ہے (الاحزاب ۳۳ : ۴)۔

دوسرے، شرک کے ہیولے میں توحید کے ساتھ آخرت کے انکار کی صورتیں بھی مضمر ہوتی ہیں۔

تیسرے، مشرکین اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے معبودانِ باطلہ کو بھی اپنا ربّ (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) مانتے ہیں۔

چوتھے، توحید دین کی اساس ہے، لہٰذا مشرکین دین کے بھی منکر ہوئے۔

پانچویں، مشرکین اللہ تعالیٰ سے نفرت اور اس کی صفاتِ اُلوہیت و ربوبیت کا عملاً انکار کرتے ہیں۔

چھٹے، شرک سے انسان کے جمالیاتی اِرتقاء کا امکان معدوم ہو جاتا ہے؛ اور یہ سب سے بڑی محرومی و ناکامی ہے۔

غور کریں تو شرک سے نہ صرف توحید و آخرت کا انکار بلکہ انسان کی اپنی تذلیل و تنزل اور اللہ تعالیٰ سے بغاوت بھی لازم آتی ہے۔ علاوہ بریں جب وہ غیر اللہ کے سامنے جھکتا ہے تو مقامِ انسانیت سے پھسل کر حیوانیت کے تحت الثّریٰ میں جا گرتا ہے۔ چونکہ شرک کی ظلمتوں سے اس کا قلب اپنے نور سے محروم ہو کر اندھا ہو جاتا ہے، اس لیے مشرکوں کو اپنی اس زبوں حالی کا شعور نہیں رہتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ شرک انسان سے نور سلب کر کے اس کے جمالیاتی ارتقاء کے امکان کو ختم کر دیتا ہے۔ الغرض اگر انسان کو عقلِ سلیم و بصیرت، علم و حکمت، شعور و آگہی، ایمان و عرفان اور حسن سرور دیتا اور اُسے صاحبِ حُسن و سُرور اور مقرّب و ولی اللہ بناتا ہے تو نور سے محروم ہو کر وہ اندھا، گمراہ، محروم و نامراد، راندۂ درگاہ، اسفل سافلین اور اہلِ نار بن جاتا ہے۔

قرآنِ مجید تاریخ کے حوالے سے انسان کو انتباہ کے طور پر اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ جو قومیں مشرک تھیں اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبود

بنا رکھے تھے، اور انہیں امداد کے لیے پکارتی، ان سے مرادیں مانگتی، انہیں اپنا شفیع، حافظ و ناصر، کارساز و حاجت روا اور سمیع و مستجیب الدّعوات سمجھتی تھیں، جب ان پر ان کے ظلم عظیم (= شرک) کی پاداش میں عذاب آیا تو ان کے معبود انہیں عذاب سے بچا سکے نہ ان کے کچھ کام ہی آ سکے، بلکہ اُلٹا ان کی ہلاکت و بربادی کا باعث بنے۔ اِرشادِ ربانی ہوتا ہے:

"یہ بعض بستیوں کی سرگزشت ہے جو ہم تمہیں سُنا رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب تک قائم یعنی آباد ہیں، اور بعض کی جڑ کٹ چکی ہے۔ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ چنانچہ جب تمہارے ربّ کا حکم آ گیا تو ان کے وہ معبود جنہیں وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے، ان کے کچھ کام نہ آ سکے اور انہوں نے ہلاکت و بربادی کے سوا انہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ تمہارا ربّ جب ظالم بستیوں کو پکڑتا ہے تو پھر اس کی پکڑ ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ اصل میں اس کی پکڑ (بڑی ہی) کربناک اور شدید ہوتی ہے (ہود ۱۱: ۱۰۱-۱۰۲)۔

اس حقیقت کی ایک بار پھر یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرک ظلم ہی نہیں، ظُلمِ عظیم اور گناہِ کبیرہ ہے، جسے وہ معاف نہیں کرتا۔ ظُلم کے متعلق حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کُفر کی حکومت تو برداشت کرتا ہے، لیکن ظُلم کی حکومت کو برداشت نہیں کرتا۔

فصل۔۳

دین کی ابتداء توحید سے ہوئی یا شرک سے؟

یہ مسئلہ اہلِ علم ونظر کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ دین کی ابتداء توحید سے ہوئی ہے کہ شرک وبت پرستی سے؟ قرآنِ مجید اور محققین کے تازہ انکشافات سے یہ بات متحقق ہوگئی ہے کہ دین کی شروعات توحید سے ہوئی ہے۔ چنانچہ ابتداء میں بنی نوع انسان توحید پرست تھے، اور ایک اللہ کی حمد وثنا اور پرستش وبندگی کرتے تھے، اور ان کا الٰہ ورب صرف ایک اللہ تعالیٰ تھا، جسے وہ وحدہٗ لاشریک، یگانہ یکتا اور مستجیب الدعوات سمجھتے تھے اور مانتے تھے۔ ان کے موحّد ہونے کے دو بنیادی عوامل تھے: ایک یہ کہ قرآنِ مجید کی رو سے جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی فطرت پر یعنی موحّد پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ معاشرتی زندگی کے آغاز میں جو بچے پیدا ہوئے ایک تو وہ موحّد تھے اور دوسرے چونکہ ان کے والدین بھی موحّد تھے، لہٰذا وہ بڑے ہو کر بھی موحّد ہی رہے۔ لیکن امتدادِ وقت کے ساتھ وحی وتنزیل اور انبیاء ورسل علیہم السلام کی تعلیمات میں لفظی ومعنوی تحریف ہونے لگی اور ساتھ ہی توہم پرستی و ساحری کا آغاز ہوگیا تو اس کے نتیجے میں شرک اپنی نمود دکھانے لگا۔ لوگوں کی توہم پرستی و ساحری اور جہالت وشرک سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی خاطر آزر پیدا ہوگئے، جو لوگوں کے دینی پیشوا بن بیٹھے، اور شرک وبت پرستی (= مظاہر پرستی، اکابر پرستی، شبیہہ پرستی وغیرہ وغیرہ) کی ترویج واشاعت کرنے لگے۔ اس سے ان کا مقصود جلبِ منفعت و اقتدار

تھا۔ چنانچہ وہ اپنی علمی فوقیت، خرقہ، سالوس اور خطابت و طلاقت کے ذریعے لوگوں کو اپنے مرید و پیرو، مطیع و خادم اور عقیدت مند و مقلّد بنانے اور ان پر اپنا حکم چلانے لگے۔ لوگوں کو کورانہ تقلید کا خوگر بنانے کے بعد انہوں نے عقیدۂ توحید کے ساتھ مشرکانہ عقائد و رسومات اور بدعات کو بھی دین کے اجزائے لاینفک بنا دیا۔

چونکہ شرک بے بنیاد اور کذب و باطل تھا اور توحید کا حریف نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا آذری پیشواؤں نے شرک و بت پرستی کے جواز کے لیے دو فنون ایجاد کیے: تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل۔ تاویل بالباطل کی کرشمہ سازیوں سے متعلق علامہ اقبال فرماتے ہیں:

احکام تیرے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پاژند (بالِ جبریل)

تاویل بالباطل سے آذروں نے وحیِ منزل اور انبیاء و رسل علیہم السلام کی باتوں کی معنوی و لفظی تحریف کی اور ایسے معانی و مطالب اخذ کیے کہ حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دیا؛ نیز سچ میں جھوٹ کی اس طرح آمیزش کر دی کہ ان میں امتیاز کرنا عام لوگوں کے لیے ازبس دشوار اور بعض صورتوں میں محال ہو گیا۔ کتمانِ حق بھی تاویل بالباطل کا کرشمہ ہے۔ تفرقہ بھی تاویل بالباطل کا مرہونِ منت ہے۔

تسمیہ بالباطل کے فن کے ذریعے آذری پیشواؤں نے اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کو ان صفات سے متصف کر دیا، جو ان میں نہ تھیں بلکہ ان کے مقدر ہی میں نہ تھیں۔ بالفاظِ دیگر، انہوں نے اپنے بزرگوں اور برگزیدہ ہستیوں کو اسمائے بے مسمّیات سے موسوم کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ایسے ناموں سے موسوم کر دیا، معنویت کے لحاظ سے جن کے وہ سزاوار نہ تھے، یعنی وہ صفات ان میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے کسی کو ابن اللہ، کسی کو اوتار، کسی کو داتا، کارساز، قطب، غوث، دستگیر، حاجت روا، شافی، ناجی، حیّ و قیّوم، حاضر و ناظر،

سمیع و بصیر، حافظ و ناصر، عالم الغیب مستجیب الدعوات وغیرہ وغیرہ ناموں سے موسوم کر دیا۔ آزری پیشواؤں کی تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے انسانیت سوز، رہزن ایمان و آگہی اور غارتگر عقل و ہوش کرشموں کو دیکھ کر ہی عالم الغیب والشہادۃ اللہ جلّ شانہٗ نے انسان کو ظلوم و جہول کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ظالم و جاہل لوگ ہی اپنے ربّ ذوالجلال والاکرام اور الٰہِ جمیل و کریم کو چھوڑ کر اس کے محتاج و دست نگر بندوں کو اپنا الٰہ و ربّ بناتے، ان کی حمد و ثنا اور پرستش و بندگی کرتے، ان کو رکوع و سجود کرتے اور ان کو اپنی حاجت روائی اور امداد کے لیے پکارتے، ان سے امیدیں وابستہ رکھتے ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے اور انھیں مستجیب الدعوات سمجھتے ہیں۔ اس کھلے شرک کے باوجود یہ ظالم و جاہل لوگ اپنے آپ کو زاہد و عابد اور مؤمن و موحّد سمجھتے اور شرک سے انکار کرتے ہیں، اس لیے کہ شرک "مُنکَر" جو ہوا۔ یہ امرِ واقعی شرک کے باطل ہونے پر واضح حجت ہے۔

اب ہم ایک اور زاویۂ نگاہ سے توحید پر غور کرتے ہیں، جو اس اعتبار سے اچھوتا ہے کہ اس پر پہلے اس انداز سے کلام نہیں کیا گیا۔ اسے تخلیقی تزویجی نقطۂ نظر سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ احسن الخالقین ہے اور اس نے جو چیز بھی بنائی ہے، حسین اور زوجین یعنی جوڑا جوڑا بنائی ہے (المؤمنون ۲۳: ۱۴؛ السجدۃ ۳۲: ۷، الذّاریات ۵۱: ۴۹)۔ یہ ربِّ کریم کی سنّتِ حسنہ ہے اور اسے ہم نے قدرت کی تخلیقی فعلیّت کے جمالیاتی۔ تزویجی قانون سے تعبیر کیا ہے۔ اس قانون کی رُو سے اس دُنیا میں ہر چیز مخلوق اور جوڑا جوڑا ہے، لیکن واحد واحد ہے نہ بے مثل و یگانہ۔ چنانچہ قرآنِ حکیم کا یہ دعویٰ کہ ساری کائنات میں فقط اللہ تعالیٰ ہی واحد واحد اور بے مثل و یگانہ ہے، سائنس نے سچّا ثابت کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم و تجربہ اور مشاہدہ یا سائنس مُصدّقِ قرآن و اسلام ہے۔ اس واقعیت

ہیں کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی یکتا و یگانہ ہے، یہ اصل مضمر ہے کہ تنہا وہی اپنی جملہ مخلوقات کا اِلٰہ و ربّ اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی بھی یکتا و یگانہ نہیں اور نہ اِلٰہ و ربّ ہے اور نہ ہو ہی سکتی ہے، اس لیے کہ "زوجین" ہے، یعنی اپنے زوج کی حاجت رکھتی ہے اور اپنے زوج کے مثل ہے، لہٰذا ایسی ہستی جو احتیاج رکھتی ہو، سبحان و صمد نہیں ہوسکتی اور نتیجتاً خدا بھی نہیں ہوسکتی۔

قرآنِ حکیم باربار انسان کو اس بصیرت افروز حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ، جو احسن الخالقین اور ربّ العالمین ہے، اس نے کائنات کو عبث و بیکار اور بے مقصد نہیں بنایا (آل عمران ۳: ۱۹۱)، بلکہ یہ تخلیق بالحق ہے (الاحقاف ۴۶: ۳)، یعنی یہ حکیمانہ افادیت و مقصدیت رکھتی ہے؛ لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کی تسخیر و تعمیر کرے اور اس سے استفادہ کرے؛ لیکن وہ اس کی تخریب و بیخ کنی نہیں چاہتا۔ اس مقصد کی خاطر اس نے ہر فردِ بشر میں خواہ مرد ہو یا عورت "خلود بالنسل" (نسل کی صورت میں ہمیشہ قائم و دائم رہنا) کی آرزو بدرجۂ غایت ودیعت کی ہے، اسے جنسی جبلّت یا جنسی جذبے سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس جذبے کی تسکین کی خاطر وہ طبعاً اپنے زوج کی حاجت رکھتا اور اپنی اولاد یا نسلی سلسلے میں اپنی ذات کے خلود کو مضمر سمجھتا ہے۔ جو ہستی زندہ رہنے کے لیے معاشرتی زندگی کی اپنی آرزوئے خلود کے اتمام اور جنسی جذبے کے لیے زوج کی محتاج ہو، عقلِ سلیم کا فتویٰ ہے کہ وہ معبود یا خدا یا خدائی صفات کی حامل نہیں ہوسکتی، چاہے وہ کتنی برگزیدہ کیوں نہ ہو، مثلاً نبیؑ، صدّیق، شہید اور صالح؛ لہٰذا وہ حمد وثنا، پرستش و بندگی اور دعا کی سزاوار بھی نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ہمیں متنبّہ کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبیؑ اور رسولؑ کی طرح سیّد المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم

کو بھی بار بار توحید پر ثابت اور شرک سے دُور رہنے کی تاکید فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

۱۔ "اے نبیؐ ! کہہ دو مجھے تو صرف اللہ کی عبادت (= پرستش و بندگی) کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ شریک ٹھیراؤں، لہٰذا میں اسی (یعنی توحید) کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے ! یعنی ہر بات کے لیے میں تنہا اللہ کی طرف رجوع کرتا ہوں، کسی اور ہستی کی طرف نہیں" (الرّعد ۱۳ : ۳۶)۔

اس آیتِ جمیلہ میں یہ اصل مضمر ہے کہ دین کا کوئی معاملہ ہو، انسان کو کوئی مسئلہ یا کوئی حاجت درپیش ہو، اسے ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، کسی اور کی طرف نہیں کہ یہ شرک ہے، دوسرے، غیر اللہ خُدا تو نہیں کہ اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ اگر مسلم اقوام اس نصِّ انسانی کو اپنا دستور العمل بنالیں تو اس کے نتیجے میں وہ شرک و بت پرستی، تفرقے یا فرقہ بندی، تضادات و مناقشات اور باہمی جنگ و جدال کی ہلاکت آفرینیوں سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔

۲۔ سورۂ انعام میں دو مقامات پر اللہ تعالیٰ نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اس طرح خطاب فرماتے ہیں۔

(۱) (اے نبیؐ ! ان لوگوں سے) کہو کیا (تم چاہتے ہو) میں اللہ کو چھوڑ کر جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، کسی دوسری ہستی کو ولی یعنی سرپرست و کارساز بنا لوں ؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کو روزی دیتا ہے، لیکن خود کسی سے روزی نہیں لیتا۔ کہہ دو کہ مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سرِ تسلیم خم کروں (اور تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے) تو بہرحال، مشرکوں میں نہ ہو جانا۔ کہہ دو ! اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو ڈرتا ہوں کہ ایک بڑے

(قیامت کے) دن مجھے اس گناہ کی سزا بھگتنا ہوگی (الانعام ۶: ۱۴-۱۵)۔

ان آیاتِ جلیلہ میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ جو بزرگ و برتر ہستی آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والی ہے اور اپنی مخلوقات کو روزی دیتی ہے اور خود بے نیاز و منزّہ عن الاحتیاج ہے، اسے چھوڑ کر اس کی محتاج مخلوقات میں سے کسی ایک یا زائد ہستیوں یا ان کی مورتیوں، شبیہوں، آستانوں، مزاروں وغیرہ وغیرہ کی پرستش کرنا، ان کو پکارنا، ان سے امداد طلب کرنا اور ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات یا کارِ روبارِ خدائی میں شریک سمجھنا، ظلم و جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ قرآن و دین کی تکذیب، توحید کی نفی اور اللہ تعالیٰ سے بغاوت نہیں تو اور کیا ہے؟ قرآنِ مجید کی رُو سے یہی تو شرک ہے، جو اس اعتبار سے کفر سے بڑا گناہ ہے کہ فقط شرک ہی ناقابلِ معافی گناہ ہے (النسآء ۴: ۴۸)۔

(ب) (اے میرے پیغمبرؐ) کہو! مجھے تو میرے رب نے بلاشبہ سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ وہی درست اور صحیح دین ہے؛ ابراہیمؑ کا طریقہ کہ ایک ہی خدا کے لیے ہو جانا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہہ دو! میری نماز، میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا جینا، میرا مرنا، سب کچھ صرف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار و مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں مسلمانوں (یعنی اللہ تعالیٰ کے فرماں برداروں) میں پہلا فرماں بردار ہوں۔ کہو! کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رازق و پروردگار (= رب) تلاش کروں؟ حالانکہ وہی ہر شے کا رب ہے۔ ہر شخص جو کماتا ہے اس کا ذمے دار وہ خود ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ پھر (بالآخر) تم سب کو اپنے ربّ کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت وہ تمہارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا (الانعام ۶: ۱۶۰ تا ۱۶۴)۔

ان آیاتِ جمیلہ میں دین کے چار اہم ترین اصول بیان کیے گئے ہیں، جن کو

اپنانے سے اہلِ ایمان جنت کے وارث بن سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دینِ اسلام پیش کیا ہے، وہ درست اور ابدی نوعیت کا ہے، اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خالص دینِ توحید ہے اور وہ موحّد تھے، مشرک نہیں تھے۔ دینِ توحید یہ ہے کہ سب معبودانِ باطلہ سے منہ موڑ کر صرف ایک اللہ کا ہو جانا اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کرنا۔ دوسرے، چونکہ مؤمن موحّد یعنی صرف اور فقط اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوتا ہے، لہٰذا اس کی نماز، عبادت (یعنی حمد و پرستش اور بندگی و دُعا) اور مناسکِ عبودیت، مثلاً ایثار و قربانی، حج، نذر و نیاز وغیرہ وغیرہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہیں، یہاں تک کہ اس کا جینا اور مرنا بھی اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے۔ تیسرے، اگر اللہ تعالیٰ ربّ العالمین ہے، یعنی سب مخلوقات کا رازق و پروردگار، کارساز و حاجت روا، داتا اور مددگار ہے اور یقیناً ہے تو پھر اس کو چھوڑ کر کسی اور ربّ کی طلب و جستجو کرنا، ظلم و جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ چوتھے، ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہے اور اسی کو اپنے اعمال کے نتائج بھگتنا پڑتے ہیں؛ کوئی دوسرا نہ تو اس کے اعمال کا ذمے دار ہو سکتا ہے اور نہ اس کی سزا اپنے سر لے سکتا ہے، نیز نہ اس کی سزا کم کر سکتا نہ کروا ہی سکتا ہے۔

آذری پیشواؤں نے لوگوں کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کے لیے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ قیامت کے دن وہ اپنے مریدوں کے گناہوں کا بوجھ خود اُٹھا لیں گے، اس طرح انہیں سزا سے بچا لیں گے۔ محوّلہ بالا ارشادِ الٰہی میں اس باطل اور گمراہ کن عقیدے کی تکذیب و نفی کی گئی ہے۔

اب سورۂ یونس کی آیات پر غور کرنے کی خاطر ان کو اپنی زبان میں پیش کرتے ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے موحّدِ اعظم و سیّد المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو مخاطب کر کے ہمیں شرک سے دور اور توحید پر قائم رہنے کا حکم منطقی دلائل کے ساتھ

دلنشین و بلیغ انداز میں دیا ہے۔

(اے پیغمبرؐ!) کہہ دو: "اے لوگو! اگر تم میرے دین کے بارے میں کسی شک میں ہو تو سن لو کہ تم اللہ کے سوا جن ہستیوں کی بندگی کرتے ہو، میں ان کی بندگی نہیں کرتا، بلکہ صرف اللہ کی بندگی کرتا ہوں جس کے قبضے میں تمہاری زندگی ہے اور جس کے حکم سے تم پر موت طاری ہوتی ہے اور مجھے اسی کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ مومنوں کے زمرے میں رہوں؛ نیز مجھے فرمایا گیا ہے کہ تو ہر طرف سے ہٹ کر اپنا رخ اللہ کے دین کی طرف کرلے اور ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہونا، اور (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارنا جو تجھے نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ نقصان۔ اگر تو ایسا کرے گا تو ظالموں میں سے ہوگا۔ اگر اللہ کے حکم سے تجھے کوئی دکھ پہنچے تو جان لے کہ اسے دور کرنے والا کوئی نہیں مگر اس کی ذات؛ اور اگر وہ تیرے حق میں کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے، اپنا فضل کر دے، وہ بخشنے والا، رحمت کرنے والا ہے (یونس ۱۰: ۱۰۴ تا ۱۰۷)۔

اگرچہ محولۂ بالا آیاتِ جلیلہ اس قدر واضح، مدلّل اور مؤثر ہیں کہ ان کو تشریح کی حاجت نہیں، لیکن اُمّتِ مسلمہ اور دیگر اقوام کے افراد جو شیطان کے وسوسوں اور اذہان کے تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے جالیاتی فریب میں آ کر شرک کو شرک ہی نہیں سمجھتے، بلکہ اسے عبادت سمجھ کر کرتے ہیں، ان کی اس انتہائی گمراہ کن غلط فہمی کو دور اور ان پہ دین کی حقیقت آشکارا کرنے کی خاطر چند نتائج مستنبط کیے جاتے ہیں:

اوّل، خاتم النبیین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، جو دین کی تکمیل کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور ربّ العالمین کے فضل سے آپؐ نے دین کی تکمیل کر بھی دی تھی اور اس پہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ پہ اپنی نعمت

پوری بھی کر دی تھی، کفّار و مُشرکین کو واشگاف الفاظ میں فرما دیا: "میرا دینِ اسلام خالص دینِ توحید ہے اور وہ یہ ہے کہ ہیں فقط اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرتا ہوں، اس کے سوا کسی اور ہستی کی عبادت نہیں کرتا، یعنی کسی کی حمد و پرستش اور بندگی نہیں کرتا۔ وجہ یہ ہے کہ صرف وہی بنی نوعِ انسان سمیت جُملہ مخلوقات کو زندگی بخشتا اور اُن کی جان لیتا ہے، اس لیے کہ موت و حیات صرف اسی کے قبضۂ اختیار میں ہیں۔

دوم، اللہ تعالیٰ کا حُکم ہے کہ میں صرف مومنوں یعنی موحّدوں کے زُمرے میں رہوں؛ مُشرکوں سے علیحدہ اور دُور رہوں اور سب ادیان و مذاہب سے موڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کے دینِ توحید کی طرف متوجّہ ہو جاؤں اور اُسی کا ہو رہوں؛ نیز کسی غیر اللہ کی بندگی تو کجا؟ اس کی طرف توجّہ تک نہ کرو، لہٰذا میں کسی حال میں بھی نہ تو شرک کروں، نہ مشرکوں میں سے ہو جاؤں۔

سوم، مجھے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ پکاروں؛ یعنی کسی سے فریاد کروں نہ اس سے مدد اور مرادیں مانگوں، اس لیے کہ وہ انسان کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان؛ لہٰذا غیر اللہ کو پکارنے والا ظالم و جاہل ہوتا ہے۔

چہارم، انسان کو کوئی دُکھ پہنچے اور وہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دُور نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا کسی کے مقدور ہی میں نہیں بخلاف اسکے اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے پر فضل کرنا چاہے تو کوئی ہستی بھی اُسے اس کے فضل و کرم سے محروم نہیں کر سکتی۔

الغرض انسان کو ہر حال میں مؤمن و موحّد رہنا چاہیے، صرف اسی کو پکارنا اور اسی سے فریاد کرنی اور مدد مانگنی چاہیئے؛ نیز فقط اسی کی حمد و ثنا اور پرستش و بندگی کرنی چاہیے۔ جو شخص اس کے برعکس کرتا ہے، وہ شرک کرتا اور ظالم و

جاہل ہے۔

یہ نکتہ بصیرت افروز و خیال انگیز ہے کہ توحید کا عقیدہ فطری ہے، غیر فطری نہیں۔ چنانچہ انسان فطرۃً خداشناس ہوتا ہے اور اپنی پیدائش کے ساتھ اس حقیقت کا عرفان لے کر آتا ہے کہ اس کا اِلٰہ و ربّ فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ عرفان اُسے روزِ "الست و شہود" یا روزِ "بلیٰ" حاصل ہوا تھا، جس کی طرف قرآنِ مجید نے سورۂ اعراف کی مندرجۂ ذیل آیاتِ جمیلہ میں خیال افروز و بلیغ اِشارہ کیا ہے:

"اور جب تمہارے ربّ نے بنی آدم سے یعنی اس ذرّیت سے جو اس کی پُشت سے (نسلًا بعد نسلٍ) پیدا ہونے والی تھی، عہد لیا تھا اور انھیں اپنے نفسوں پہ شاہد ٹھیرایا تھا (اور پوچھا تھا)۔ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا۔ ہاں! تو ہی ہمارا ربّ ہے۔ ہم اس کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ اس لیے کیا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ تم قیامت کے دن کہو، ہم تو اس سے بے خبر تھے۔ یا یہ کہو کہ شرک تو بلا شبہ پہلے ہمارے اسلاف نے کیا تھا، اور ہم ان کے اخلاف کی نسل میں سے تھے۔ تو کیا تُو ہم کو اس بنا پہ ہلاک کرتا ہے، جو باطل پرستوں نے کیا؟ اور اسی طرح ہم کھول کھول کر آیات بیان کرتے ہیں تاکہ وہ (اپنی اصل فطرت یا توحید کی طرف) رجوع کریں (الاعراف ۷: ۱۷۲ تا ۱۷۴)۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اس حقیقت کا اعلان کہ خدا کی ہستی کا اعتقاد انسان کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور فطرتِ انسانی کی اصل آواز "بلیٰ" ہے؛ یعنی تصدیق ہے، انکار نہیں ہے، اور اسی لیے کوئی انسان اپنی غفلت کے لیے معذور نہیں ہو سکتا کہ اباؤ اجداد کی گمراہی سے میں گمراہ ہو گیا، کیونکہ اس کے وجود سے باہر گمراہی کے کتنے ہی مؤثرات جمع ہو جائیں، لیکن اس کی فطرت کی اندرونی آواز کبھی دب نہیں سکتی، بشرطیکہ وہ خود اس کے

دبا نہ دے، درپے نہ ہو جائے اور اس کی طرف سے کان بند نہ کر لے

(ترجمان القرآن، جلد دوم، ص ۴۳ حاشیہ)۔

ان آیاتِ قرآنی میں یہ دلیل مضمر ہے کہ نفسِ انسانی اس حقیقت کا اذعانی شعور رکھتا ہے کہ ربّ (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) اللہ تعالیٰ ہی ہے اور یہ ایسی دلیل ہے، جسے تاریخ و مشاہدہ کے علاوہ خود فطرتِ انسانی کی تصدیق حاصل ہے۔ چنانچہ ہر زمان و مکان میں ہر قوم میں توحیدِ ربوبیت کا عقیدہ و تصوّر رہا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآنِ مجید اور دیگر کتبِ سماوی سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام مبعوث فرمائے جنہوں نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ علاوہ بریں، عصرِ حاضر میں اشتمالی ممالک میں، جنہیں سیکولر یا لادین کہتے ہیں اور جہاں اللہ تعالیٰ کا نام لینا جرم ہے، وہاں بھی لاکھوں، کروڑوں انسان اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ و ربّ مانتے ہیں؛ اور جو لوگ اپنے آپ کو منکرِ خدا کہتے ہیں، ان کے دلوں میں بھی نام خدا اس طرح مرتسم ہے کہ وہ نہ محو ہو سکتا ہے اور نہ اس کی کسک ہی مٹ سکتی ہے۔ چنانچہ جب بھی ان "منکرانِ خدا" پر آفت آتی ہے یا وہ گرفتارِ بلا ہوتے ہیں تو ان کے دل خود بخود اضطراری طور پر اپنے ربّ کو مدد و مشکل کشائی کے لیے پکارنے لگتے ہیں، چاہے وہ کسی وجہ سے زبان سے اس کا اِظہار نہ کریں۔ اس حقیقت کو قرآنِ مجید نے اس طرح بیان کیا ہے:

بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ (القیٰمۃ ۷۵: ۱۴)؛ بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ دلیل ہے۔ یہ کیوں ہے کہ کفار ہوں یا مشرکین، اشتمالی ہوں یا وجودی؟ کوئی ہوں، سبھی خدا کا نام لیتے ہیں؟ چاہے بر سبیلِ انکار ہی لیں۔ یہ نام لینا ان کے دل کی اس خلش کی غمازی کرتا ہے جو ان کے عرفانِ الٰہی کا فطری خاصہ ہے۔ اس لذّتِ خلش سے ہر دل آشنا ہے۔ یہ انسان کا ظلم و جہل ہے کہ

جانتا ہے پر مانتا نہیں

فصل ۔۴

توحید تمام ادیان میں قدرِ مشترک ہے

توحید ایک ایسا عقیدہ ہے جو اہلِ کتاب میں پایا جاتا ہے، اور وہ اسے قولاً مانتے بھی ہیں۔ یہ تمام ادیان میں قدرِ مشترک ہے۔ یہ یاد رہے کہ ہر قوم جو خدا کو مانتی اور کتابِ سماوی رکھتی ہے، اہلِ کتاب ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے دُنیا کے ہر علاقے اور بستی میں اپنا نبی و رسولؑ مبعوث کیا اور اُسے کتاب دی تاکہ اس کے باشندے رُشد و ہدایت حاصل کریں۔ یہ انسان کا ظلم و جہل ہے کہ عقیدہ توحید رکھنے کے باوجود اور خاص کر اہلِ کتاب میں سے بیشتر لوگ شرک کرتے ہیں اور عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ حدّ تو یہ ہے کہ مشرکین ان لوگوں پر، جو سچے مؤمن و موحّد ہیں اور انہیں شرک سے منع کرتے ہیں، یہ الزام دھرتے ہیں کہ وہ اولیاء اللہ کے منکر ہیں، اور خود اپنے آپ کو موحّد کہتے اور مشرک کہلانا پسند نہیں کرتے۔ وجہ یہ ہے کہ توحید دینِ فطرت ہے، اس لیے قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں "معروف" ہے۔ معروف کا مطلب یہ ہے کہ انسان فطرۃً توحید کو حُسن و حق سمجھتا اور اپنے آپ کو موحّد کہلانے میں فخر و مسرّت محسوس کرتا ہے۔ بخلاف اس کے شرک توحید کی ضد و نقیض ہے، اس لیے قبیح و باطل یا اصطلاحِ قرآنی میں "مُنکر" ہے۔ مُنکر کا مطلب یہ ہے کہ انسان طبعاً جانتا ہے کہ شرک باطل و قبیح اور ظلم و جہل ہے، لہٰذا اسے اپنی ذات سے منسوب کرنا اور مشرک کہلانا

پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ یہ سامنے کی بات ہے کہ ہر دین و مذہب اور فرقے میں بعض لوگ کھلم کھلا شرک کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو مشرک کہلانا پسند نہیں کرتے۔ علاوہ بریں، وہ شیطان کی فریب کاری اور آرزوں کی تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل سے مرعوب و مسحور ہو کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کے مشرکانہ عقائد اور مناسک و رسومات اصلِ ایمان و عبادت ہیں۔

قرآنِ حکیم اور احادیثِ طیبہ سے ثابت ہے کہ انسان فطرۃً مومن و موحّد ہوتا ہے اور حسن، وحق اور عدل و حسنہ کو پسند کرتا، اور قبح و باطل اور ظلم و سیئہ سے نفرت کرتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کیوں کفر و شرک، جرم و گناہ اور ظلم و سیئہ کرتا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اپنے موضوعی و معروضی شیطان کی وسوسہ اندازی و جمالیاتی فریب کاری کے سبب۔ اصل، یہ ہے کہ انسان کا نفسِ امارہ جو اس کا موضوعی شیطان ہے اور ابلیس جو اس کا معروضی شیطان ہے، دونوں مل کر اپنی وسوسہ اندازی اور جمالیاتی فریب کاری کے ذریعے شرک کو توحید، قبح کو حسن، باطل کو حق، شر کو خیر، ظلم کو عدل، الغرض ہر جرم و گناہ کو حسین بنا کر کے دکھاتے ہیں اور انسان اس حسین دھوکے میں مارا جاتا ہے۔ اس موضوعی و معروضی شیطان کے جمالیاتی فریب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے حریف ابنِ آدم کے اندر ایک طرف اس کی آرزوئے حسنہ و زندگی کو قبیح بنا کر دکھاتا ہے تو دوسری طرف اس میں آرزوئے سیئہ و مرگ کو پیدا کرتا اور اسے خوشنما و دلکش بنا کر دکھاتا ہے۔ جو لوگ اس کے اس جمالیاتی دھوکے میں آجاتے ہیں وہ حسن و زندگی اور ان کی آرزو سے محروم ہو کر مشرک و مردہ اور اہلِ نار بن جاتے ہیں۔

اسلام دینِ فطرت اور توحید کا سب سے بڑا داعی ہے۔ توحید از بس اہم و اساسی اور وسیع المعانی و جامع اصطلاح ہے۔ اس کے معانی کا خلاصہ یہ ہے کہ

جملہ بنی نوع انسان نفسِ واحدہ کی طرح ہیں اور سب اولادِ آدم ہیں، اس لیے نسلاً و اصلاً ایک ہیں، نیز وہ سب اللہ تعالیٰ کی جمالیاتی تخلیقی فعلیت کے شاہکار ہیں اور وہی سب کا اِلٰہ و ربّ ہے۔ چونکہ سبھی ادیان و مذاہب کے پیروکار جو سماوی کتب رکھنے کے مدّعی ہیں، اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا اِلٰہ و ربّ مانتے ہیں، لہٰذا اسلام عقیدۂ توحید کو بین الاقوامی اتحاد و یگانگت اور امن و سلامتی کی اساس بنانا چاہتا ہے؛ اور انہیں دعوت دیتا ہے کہ وہ عقیدۂ توحید کو، جو سب میں قدرِ مشترک ہے، قولاً و فعلاً تسلیم کرلیں اور اس پر متفق ہوجائیں۔ اس دعوتِ توحید کو قرآنِ مجید نے اس معجز نما بلاغت سے بیان ہے کہ ایک تو اس میں جامعیت و مانعیت پیدا ہوگئی ہے۔ دوسرے اگر اسے قبول کرلیا جائے تو شرک نابود ہوجائے، اور ظلم و جہل کی تاریکیاں چھٹ جائیں اور معاشرتی سرطان اپنی موت آپ مرجائیں اور اس کے نتیجے میں دُنیا اخوّت و محبّت، عدل و مساوات، آزادی و خوشحالی اور امن و سلامتی کی جنّت بن جائے۔ دعوتِ اسلام یہ ہے:

(اے پیغمبرِ اعظم و آخرؐ)! تم کہہ دو: اے اہلِ کتاب (اختلاف و نزاع کی باتیں چھوڑکر) اس بات کی طرف آؤ (یعنی اس پر متفق ہوجاؤ) جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور سے مُسلّم ہے (اور وہ یہ ہے کہ) ہم اللہ کے سوا ہرگز کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا ربّ بنائے۔ اگر وہ اس دعوت سے روگردانی کریں (اور نہ مانیں) تو تم صاف کہہ دو کہ گواہ رہنا کہ ہم مُسلم یعنی اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرماں بردار ہیں (آلِ عمران ۳: ۶۴)۔

یہ آیتِ جلیلہ ان مُسلم فرقوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے جو اپنے آپ کو مؤمن و موحّد اور توحید کے داعی سمجھتے ہیں اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے، ان کی حمد و ثنا اور پرستش و بندگی کرتے، انہیں

پکارتے اور ان سے مدد اور مرادیں مانگتے ، نیز ان کو اپنا معبود و مالک، کارساز و حاجت روا، رازق و مشکل کشا ،حافظ و ناصر، حاضر و ناظر، عالم الغیب و مستجیب الدعوات سمجھتے ہیں۔ علاوہ ازیں، مجسموں، شبیہوں ، قبروں، آستانوں پر رکوع و سجود کرتے اور پیروں ، فقیروں ، بزرگوں ، اماموں اور اولیاء اللہ کی پرستش کرتے اور انہیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں ۔

اس دعوتِ توحید کی غایت یہ تھی اور ہے کہ کم سے کم وہ لوگ جو رب العالمین کو ماننے والے ہیں دنیا میں اتفاق و ہم آہنگی اور امن و سلامتی سے زندگی بسر کریں اور شرک سے بچیں، اور اس کے نتیجے میں دُنیا میں آتشِ خوف و حزن کے کرب اور آخرت میں جہنم کے عذاب النار سے محفوظ رہیں اور اگر ان سے جرم و گناہ سرزد بھی ہو جائیں تو ان کی بخشش و نجات کا امکان باقی رہے ، لیکن ہم جو اہلِ کتاب کو یہ دعوتِ توحید دینے پر مامور ہیں ، خود اس دعوت کو عملاً تسلیم نہیں کرتے ، اور ہماری مشرکانہ زندگی اس پر شاہد ہے ۔ ہمارے معاشرتی شرطان ، ہماری سودی معیشت، مزار، ہمارے پیروں کے آستانے، ہماری بدعات اور مشرکانہ رسومات اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہیں کہ ہم اس دعوتِ قرآن کو مسترد کر چکے ہیں اور قرآنِ مجید کو جو اللہ تعالیٰ کی حبل المتین ہے چھوڑ چکے ہیں ۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ مختلف مذاہب اور فرقوں میں منقسم ہے ، جن میں اتحاد و اتفاق اور ہم آہنگی و یگانگت کے بجائے تشتت و افتراق اور عداوت و مخاصمت ہے اور ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں ، نیز وہ ذلّت و مسکنت کے شکار، درماندہ و پس ماندہ اور ہلاکت و بربادی کے غار کے دہانے پر کھڑے ہیں ۔ اس پر بھی ان کے ظلم و جہل کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے آپ کو مؤمن و موحّد، مبلّغِ قرآن ، عاشقانِ رسولؐ اور ناجی سمجھتے ہیں ۔ تدبّر فی القرآن ، مطالعۂ تاریخ اور تفکّرِ مسلسل سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس صورتِ حال کے

ذمے دار چار سرطانی طبقے ہیں، جنہیں قرآنِ مجید کی تلمیحات کے حوالے سے فرعونی، ہامانی، قارونی اور آزری طبقات سے تعبیر کر سکتے ہیں اور ان کے استیصال کے بغیر اُمّتِ مُسلمہ کی نشاۃ الثّانیہ، تحریکِ اسلام کا احیاء اور مسلم معاشروں کی اصلاح اور انہیں اسلامی بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب ایک ایسی نصِّ قرآنی پیش کی جاتی ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسے عقائدِ باطلہ و مشرکانہ کا بطلان کیا گیا ہے جو نفس کے سرطان ہیں اور مختلف صورتوں میں اُمّتِ مسلمہ سمیت قریب قریب ہر قوم میں پائے جاتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کو مانتی ہیں۔ ان عقائد سے اللہ تعالیٰ کی بعض بنیادی صفات کی نفی لازم آتی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہوتا ہے: "(صاف) کہہ دو! حمد و ثنا صرف اللہ کے لیے ہے۔ وہ نہ تو اولاد رکھتا ہے اور نہ اس کی بادشاہت میں اس کا کوئی شریک ہے، نیز وہ عاجز نہیں کہ اس کا کوئی مددگار ہو (وہ ان ساری باتوں سے بے نیاز ہے، اس لیے کہ سبحان و صمد اور عزیز و قدیر ہے)۔ اس کی اس قدر بڑھائی کرو جس قدر بڑھائی کرنے کا حق ہے (الاسراء ۱۷: ۱۱۱)۔

یہ آیتِ جلیلہ جن حقائق کی آئینہ دار ہے، اب ان سے فرداً فرداً بحث کی جاتی ہے:

اوّل: یہ عقیدہ تو سب اقوام میں پایا جاتا ہے، جو خدا پر ایمان رکھنے کی مدّعی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی حمد و ثنا کا حقدار ہے اور اسی کی ثنا و تعریف کرنی یا اس کے گن اور بھجن گانے چاہییں، لیکن اُمّتِ مسلمہ سمیت سب میں ایسے فرقے پائے جاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے بزرگوں، اولیاء اللہ اور برگزیدہ ہستیوں کی بھی حمد و ثنا اسی طرح کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کی کرتے ہیں، بلکہ بعض تو اس سے بھی زیادہ ان کی تعریف و ستائش کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید کی نظر میں یہ شرک ہے، اس لیے

ہر برگزیدہ ہستی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے داتا ر، بیٹا یا اس کی ذات کا حصہ نہیں، اس لیے کہ کسی بندے کا ایسا ہونا محال ہے) اور اپنے خالق ایسی ہو نہیں سکتی بشر ہو یا کوئی اور مخلوق خدائی صفات کی مالک نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ ایسا ہونا اس کے مُقدّر ہی میں نہیں۔ ایسا عقیدہ رکھنا صاف شرک ہے، جو جہل، ظُلمِ عظیم اور ناقابلِ عفو گناہ کبیرہ ہے۔ یہ کتنی المناک و عبرتناک حقیقت ہے کہ بعض مُسلم فرقے بھی یہ شرک کرتے ہیں۔ ان فرقوں کے جہلِ مرکب کا یہ عالم ہے کہ وہ شرک کو عبادت و کارِ ثواب سمجھ کر کرتے ہیں، اس لیے ان میں نہ تو شرک سے باز آنے کی آرزو پیدا ہو سکتی ہے اور نہ وہ اپنی اصلاح کر سکتے اور موحّد و مؤمن ہی بن سکتے ہیں۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اپنے احوال و ظروف میں حُسنِ انقلاب پیدا کرنے سے پہلے اس کی آرزو کو اپنے دل میں پیدا کرنا ناگزیر ہے۔ مشرکین کا المیہ یہ ہے کہ وہ شرک کو شرک یا ظلمِ عظیم و گناہِ کبیرہ سمجھنے کے بجائے عبادت سمجھتے ہیں، اس لیے ان کے دلوں میں نہ تو ترکِ شرک کی اور نہ دعوتِ توحید کو قبول کرنے کی آرزو کا اِحیاء ہی ہو سکتا ہے۔ سورۂ فاتحہ قرآنِ حکیم کا دیباچہ اور اس اعتبار سے اہم ترین سورت ہے کہ اسے ہر نماز اور اس کی ہر رکعت میں پڑھنا فرض ہے، ورنہ نماز نہیں ہوتی۔ اس اوّلین و اہم ترین سورت کی اوّلین آیت میں فطرتِ انسانی میں مضمر اس حقیقت کو اس کی زبان سے فطری عرفان و اذعان اور اعتراف و ایقان کے طور پر اس طرح کہلایا ہے کہ "حمد و ثنا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، جو ربّ العالمینؑ رحمٰن و رحیم ہے! اور مالکِ یوم الدّین ہے۔ ہم فقط تیری ہی عبادت کرتے اور صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں راہ راست دکھا اور اس پر چلا جو تیرے انعام یافتہ بندوں کی راہ ہے جو نہ مغضوب ہوئے نہ گمراہ" (۱: ۱تا ۷)۔

یہ دُعا فطرتِ انسانی اور ہر فردِ بشر کی روح کی صدا ہے۔ اس میں مندرجۂ ذیل حقائق کا براہینِ قطعیہ کے ساتھ اعتراف کیا گیا ہے:

اوّل، حمد و ثنا صرف اللہ کے لیے ہے۔ لفظ اللہ کے معانی میں یہ دلیل مضمر ہے کہ چونکہ وہ ان تمام صفاتِ حسنہ کا مالک ہے جو انسان کے علم میں ہیں یا ان کا تصوّر کر سکتا ہے؛ نیز وہ اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود ہے، لہٰذا وہ سزاوارِ حمد و ثنا ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر ہستی اس کی مخلوق و مربوب اور فقیر و دست نگر ہے، لہٰذا وہ اپنے خالق و ربِّ عزیز و قدیر کی طرح کُل صفاتِ حسنہ یا صفاتِ الٰہیہ کی نہ تو مالک ہو سکتی ہے اور نہ ایسا ہونا اس کے مقدر ہی میں ہے، اس لیے وہ اپنے اِلٰہِ جمیل و ربِّ ذوالجلال والاکرام کی طرح حمد و ثنا کی سزاوار نہیں ہو سکتی؛ لہٰذا جو شخص غیر اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہے، وہ اپنی روح کی صدائے حق کو جھٹلاتا اور فطرتِ انسانی یا انسانیت کی تکذیب کرنے کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی اُلُوہیت میں غیر اللہ کو شریک کرتا ہے، جو جہل اور ظلمِ عظیم ہے۔ علاوہ بریں، کسی کی حمد و ثنا کرنا اُسے صفاتِ الٰہیہ کا مالک یا خدا سمجھنا اور بنانا ہے، اور یہ صریحاً شرک ہے؛ نیز اس سے بلحاظِ صفات اللہ تعالیٰ کی مطلق و یکتا حیثیت کی نفی لازم آتی ہے؛ یعنی اس حقیقت کی کہ وہ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ اور وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ ہے۔

دوم، اس دُعا میں دوسری دلیل یہ ہے کہ چونکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کُل جہانوں کا خالق و مالک اور ان کی نشو و نما کرنے والا ہے، لہٰذا وہ اپنی مخلوقات کی حمد و ثنا کا حقدار ہے۔ بخلاف اس کے چونکہ اس کائنات میں ہر چیز اور ہستی اس کی مخلوق و پروردہ ہے اور اپنے ربّ کی طرح کوئی چیز نہ تو پیدا کر سکتی اور نہ اس کی طرح اس کی ربوبیت ہی کر سکتی ہے، لہٰذا وہ نہ تو ربّ ہو سکتی ہے اور نہ حمد و ثنا کی سزاوار۔ قرآنِ مجید نے توحید سے متعلق دو حسین و بلیغ اور فکر انگیز و بصیرت افروز

نکات بیان کیے ہیں۔ ایک یہ کہ "اے لوگو جو ایمان لائے یاد رکھتے ہو، ایمان لاؤ" (جس طرح ایمان لانے کا حق ہے؛ النساء ۴ : ۱۳۶)۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ایمان محض زبان سے توحیدِ اُلوہیت و ربوبیت اور دیگر ارکانِ اسلام کے اقرار کرنے کا نام نہیں، بلکہ اس کو اپنے اندر خون کی طرح جذب کرنے اور اس کے مطابق عمل کرنے سے عبارت ہے۔ ایمان عمل سے معتبر بنتا اور اس میں قوتِ حیات اور جمال وجلال پیدا ہوتا ہے۔ ایمان جس کے مطابق انسان زندگی نہ کرے وہ ساقط الاعتبار اور مردہ ہوتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ جو اہلِ ایمان توحیدِ اُلوہیت و ربوبیّت کے عقیدے کو اپنی زندگی کا جزوِ لاینفک بنا کر اس پر عمل کرتے ہیں، وہی سچے مؤمن ہوتے ہیں؛ نیز وہی موحّدِ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام اور موحّدِ بے مثال حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی دعوتِ توحید کو سچے دل سے قبول کرتے اور ان کے اسوۂ حسنہ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا اِلٰہ و ربّ سمجھتے نہ بناتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر، وہ نہ تو کسی کی حمد و ثنا اور بندگی کرتے اور نہ کسی کو پکارتے، اور نہ ان سے مدد اور مرادیں ہی مانگتے ہیں؛ نیز وہ غیر اللہ کو اپنا داتا (= رازق و خدا)، کارساز و مشکل کشا، دستگیر و حاجت روا، حافظ و ناصر یا نجات دہندہ و مستجیب الدّعوات سمجھتے نہ مانتے ہیں۔ ایسے مؤمنوں اور موحّدوں کو اللہ تعالیٰ یہ مژدۂ کامرانی دیتا ہے:

"جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا ربّ ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے۔ ان پر یقیناً فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں: "ہرگز خوف نہ کھاؤ اور نہ غم ہی کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنّت کی خوشخبری سے، جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے"۔ ہم دُنیا کی زندگی میں تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جس چیز کی خواہش کرو گے وہ تمہاری ہوگی اور جو شے تم مانگو گے وہ بھی تمہاری ہوگی۔

یہ سامانِ ضیافت اس ربّ) کی طرف سے ہے جو غفور و رحیم ہے (فصلت ۴۱: ۳۰تا ۳۲، نیز دیکھیے الاحقاف ۴۶: ۱۳-۱۴)۔

سوم، تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، جو تمام جہانوں کا پروردگار و مالک اور نشو و ارتقا کرنے والا ہے، رحمٰن و رحیم ہے۔ چونکہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی بھی رحمٰن نہیں اور نہ ہو ہی سکتا ہے، لہٰذا وہ حمد و ستائش کا سزاوار بھی نہیں۔ اب رحمٰن کی مختصراً صراحت کر دی جاتی ہے۔ اگرچہ رحمٰن و رحیم دونوں الفاظ کا مادّہ ایک ہی ہے، یعنی رح م؛ لیکن لفظ رحمٰن اس کی مطلق و تمام اور ابدی و ازلی رحمت پر دلالت کرتا ہے اور لفظِ رحیم میں رحم کے اعادہ و تکرار اور کثرت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ رحمٰن ہر حال میں رحمٰن ہے، جبکہ رحیم احوال و ظروف کی رعایت سے رحم کرنے والا ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید نے مندرجہ ذیل آیات میں بالخصوص لفظ رحمٰن کی احسن و جامع تفسیر کی ہے:

۱۔ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ط یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پہ رحمت کو لازم کر رکھا ہے (الانعام ۶: ۱۲)۔

۲۔ کَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (الانعام ۶: ۵۴): یعنی تیرے رب نے رحمت کو اپنے اور لازم کر رکھا ہے۔

۳۔ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ط (الانعام ۶: ۱۳۳): اور تیرا رب بے احتیاج بے نیاز صاحبِ رحمت ہے۔

محدّثین و مفسّرین کا اس حقیقت پہ اتفاق ہے کہ رحمٰن تنہا اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں ہے، لہٰذا حمد و ثنا کا سزاوار بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا، اور ایسا کرنا یا سمجھنا شرک ہے۔

چہارم، چوتھی دلیل یہ ہے کہ وہ اس لیے سزاوارِ حمد و ثنا ہے کہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

(الفاتحہ ۱:۳): یعنی وہ یومِ جزا کا مالک ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک یوم الدّین اُخروی اور دوسرا دُنیوی ہے۔ اُخروی یوم الدّین قیامت کا دن ہے، جو کُل حیاتِ انسانی کے اعمال کے محاسبے اور جزا و سزا کا دن ہے۔ دُنیوی یوم الدّین سے مراد یہ ہے کہ ہر لمحۂ زندگی انسان کا یوم الدّین ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سریع الحساب بھی ہے، لہٰذا وہ ہر آن اپنے بندوں کے اعمال کا محاسبہ کرتا اور ان کی نوعیّت کے مطابق انہیں جزا و سزا دیتا رہتا ہے، یہ اور بات ہے کہ اس کا شعور کم رکھتے ہیں۔ الغرض، چونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ نہیں، اس لیے قرآنِ مجید کی رُو سے وہ سزاوارِ حمد و ستائش نہیں ہو سکتی، لہٰذا اس کی حمد و ثنا کرنا شرک ہے۔ یہ کتنی تلخ و عبرتناک حقیقت ہے کہ توحید کی بنا پر قائم ہونے والے پاکستان میں اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری ہستیوں کی حمد و ثنا ہوتی ہے، ربِّ ذوالجلال والاکرام کی طرح ہوتی ہے اور برملا ہوتی ہے، مثلاً مسجدوں، مجلسوں، جلسوں، مشاعروں میں، نیز ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پریس کے ذریعے ہوتی ہے۔ اوّل تو آذری سرطانوں کی تشہیر بالباطل کی وجہ سے قوم کی اکثریت شرک کو شرک ہی نہیں سمجھتی، دوسرے اگر کوئی موحّد جرأت کر کے شرک کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے آذری طبقے اور اس کے متّبعین اولیآ اللہ کا منکر وغیرہ کہہ کر خاموش کر دیتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ نقّار خانے میں طوطی کی آواز سن بھی کون سکتا ہے؟ یہ یاد رہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمے دار اسلامی حکومت ہوتی ہے؛ لہٰذا جو حکومت اپنی اس ذمے داری سے عہدہ برآ نہیں ہوتی، وہ اسلامی نہیں ہوتی۔

پنجم، پانچویں دلیل یہ ہے کہ انسان فطرۃً جانتا اور پہچانتا ہے کہ اس کا معبود تنہا اللہ تعالیٰ ہے اور فقط وہی پرستش و اطاعت کا سزاوار ہے اور اس کے سوا اور کوئی

معبود نہیں اور نہ پرستش و بندگی کا سزاوار ہی ہے، نیز تنہا وہی اپنے بندوں کی دعاؤں کو سُن سکتا، ان کی مدد کر سکتا اور ان کی حاجات کو پورا کر سکتا ہے۔ اس کے سوا دوسری کسی ہستی میں یہ قدرت نہیں، اس لیے کہ وہ "خدا" نہیں، سمیع و بصیر اور عزیز و قدیر نہیں۔ ربِّ کریم نے انسان کو عقل و فکر ایسی نعمتِ عظمیٰ دی ہے، اُسے غور کرنا چاہیئے کہ جو ہستی چاہے کتنی برگزیدہ کیوں نہ ہو، خود اللہ تعالیٰ کی نیاز مند و محتاج ہو، اور اپنی حسنہ و خیر، رُشد و ہدایت، کامیابی و نجات کے لیے اس کے فضل و کرم اور رحمت و نصرت کی محتاج و طلبگار ہو، نیز جو خود اس سے دُعا مانگتی، اس پر توکل کرتی اور اُسے اپنا کارساز و حاجت روا اور مستجیب الدعوات سمجھتی ہو، وہ دوسروں کی کارساز و حاجت روا، غوث و دستگیر، حافظ و ناصر اور رازق و داتا کیسے ہو سکتی ہے؟ کیا کسی غیر اللہ کو ایسا سمجھنا ظلم و جہل اور شرک نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر ہمیں خلوصِ دل سے تسلیم و اعتراف کرنا ہوگا کہ ہم واقعی ظالم و جاہل اور مشرک ہیں اور ہمیں عزم بالجزم کے ساتھ ربِّ کریم کے حضور توبۃ النصوح کرنا ہوگی، نیز ہمیں شرک سے اس طرح گریزاں و ترساں رہنا ہوگا، جس طرح ہم مردم خور درندوں سے معمور جنگل میں تنہا اور اکیلے جانے اور گزرنے سے ڈرتے اور گریز کرتے ہیں۔

ششم، چھٹی دلیل یہ ہے کہ حقیقی ہادی و مُرشد اللہ تعالیٰ ہے اور اس کی ہدایت ہی سچی ہدایت یا الھُدیٰ ہے، نیز اپنے ان بندوں کو حقیقی کامیابی کی راہِ راست دکھانے اور چلانے کی قدرت صرف اسی کو ہے، جو اس کی جنّت اور اس کے انعام یافتہ و محبوب اور راست رو دوستوں کی صحبت و رفاقت اور خود اس کے قربِ حضوری اور لقا و رضا کی طلب و جستجو رکھتے ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے اور قرآنِ مجید اور احادیثِ طیبّہ کی رُو سے حقیقت ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب "الھُدیٰ" کو چھوڑ کر کسی اور ہستی یا کتاب کی طرف ہدایت کے لیے رجوع کرنا ظلم و جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ قرآنِ مجید کے نزدیک یہ شرک ہے، اور اسے وہ اپنی زبان میں

اس طرح بیان کرتا ہے :

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ..... عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (التوبۃ ۹ : ۳۱) : انہوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو اپنا ربّ بنا لیا ہے ، اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی ؛ حالانکہ انہیں جو کچھ حکم دیا گیا تھا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک اِلٰہ (= معبود یا خدا) کی بندگی کرو۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی۔ پاک و منزّہ ہے وہ ان باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں :

عدیؓ بن حاتم سے روایت ہے کہ اس آیت کے نزول پر رسول اللہ صَلَّی اللہُ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ لوگ یعنی (یہود و نصاریٰ) علماء و مشائخ کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا : "کیا ایسا نہیں تھا کہ جو اللہ نے حلال کیا ہے اُسے وہ حرام کہہ دیتے تو لوگ بھی اُسے حرام سمجھ لیتے اور جو اللہ نے حرام کیا ہے اُسے حلال کہہ دیتے تو لوگ بھی اُسے حلال سمجھ لیتے ؟" انہوں نے عرض کیا : "ہاں" (مشکوٰۃ شریف) ۔

یہی صورتِ حال اکثر مسلم اقوام کی ہے جو اپنے علماء و مشائخ کی باتوں کو چاہے قرآنِ حکیم کے منافی کیوں نہ ہوں ، احکامِ اِلٰہی کی طرح مانتے ہیں ؛ حالانکہ قرآنِ مجید نے صاف الفاظ میں صراحت کر دی ہے کہ "وہ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا" (الکہف ۱۸ : ۲۶) ؛ لیکن معاشرتی سرطان اپنی تاویل باباطل کے ذریعے احکامِ الٰہیہ میں اپنے احکام کو بھی خلط ملط کرتے رہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ربِّ جلیل نے قرآنِ مجید میں اسلام کا جو نقشہ پیش کیا ہے ، اس میں تاویلات و تعصّبات سے اس قدر رنگ آمیزی کر دی گئی ہے اور اسے وضعی نقوش سے اس طرح مزیّن کر دیا گیا ہے کہ اس کے حقیقی و وضعی نقوش میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ چنانچہ

یہی وجہ ہے کہ کسی مُسلم ملک میں بھی اسلامی نظام قائم نہیں، اور نہ قائم ہی ہو سکتا ہے، جب تک کہ یہ اقوام شرک کو چھوڑ کر عقیدۂ توحید کو جزوِ زندگی نہ بنالیں اور اس کے مطابق زندگی کے ہر گوشے میں عمل نہ کریں۔ یہ یاد رہے کہ توحید کے اوّلین تقاضوں میں ہے کہ فقط اللہ تعالیٰ ہی حکم دینے کا حقدار ہے، اس کے علاوہ کوئی آذر یا فرعون حکم دینے یا حکم چلانے کا مجاز نہیں، لہٰذا ان کی کوئی بات یا حکم نہ مانا جائے نہ اس پر عمل ہی کیا جائے؛ نیز اسلامی معاشرہ فرعونی و آذری اور قارونی و ہامانی سرطانوں سے پاک و صاف ہونا چاہیئے۔

فصل - ۵

بطل پرستی (HERO WORSHIP)

شرک کی ایک مقبولِ عام صورت، جو قریب قریب ہر دین و مذہب میں پائی جاتی ہے، بطل پرستی ہے، جسے قرآنِ حکیم کی زبان میں غیر اللہ کو اپنا ولی (= کارساز) بنانا کہتے ہیں۔ یہ ابلیس کے جمالیاتی فریب کی عالمگیر کامیابی ہے کہ مسلمانوں، اہلِ کتاب اور کفار و مشرکین میں سے جو لوگ بھی یہ شرک کرتے ہیں، اسے عبادت، نیکی اور کارِ ثواب سمجھ کر کرتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ موحدین کو مطعون اور ان پر بہتانات تراشی کرتے ہیں، جو بحکم ربّ العزّت غیر اللہ کو اپنا ولی بنانے کو شرک سمجھتے، کہتے یا انہیں اس ظلمِ عظیم سے باز رکھنے کی تلقین و کوشش کرتے ہیں۔ شرک و بت پرستی کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کا آغاز بطل پرستی یا غیر اللہ کی محبت و عقیدت کی شدّت کے باعث ان کی پرستش یا انھیں اپنا ولی و مولیٰ سمجھنے اور بنانے سے ہوا تھا۔ چنانچہ شرک کی اس بنیاد کو منہدم کرنے اور اس ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ سے انسان کو باز رکھنے اور اس میں اس حقیقت کا ایقان و اذعان پیدا کرنے کی خاطر کہ بنی نوع انسان کا "ولی" صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہے، جو ربِّ رحمٰن و رحیم، فاطرِ ہستی، رازق و کارساز، وکیل و نصیر، جوّاد و وہّاب، غفور و رؤف، محسن و منعم اور مولیٰ و کریم، نیز توّاب و مستجیب الدّعوات ہے، قرآنِ حکیم طرح طرح کے اسالیبِ بیان اختیار کرتا اور دلائلِ قطعیہ دیتا ہے چنانچہ

سورۂ انعام میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرہانِ قاطع کے ساتھ مفصلۂ ذیل ارشاد فرماتا ہے، جو دراصل ہر اہلِ ایمان کے لیے اس کا فرمان ہے:

۱۔ قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا ...... الْمُشْرِكِينَ ٥ (الانعام ۶: ۱۴):

(اے نبیؐ!) کہہ دو! کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو ولی (= سرپرست و کارساز) بناؤں؟ حالانکہ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد و خالق ہے اور وہ روزی تو دیتا ہے روزی لیتا نہیں ہے۔ کہو! مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں (ان میں) سب سے پہلا فرماں بردار بنوں، جو فرماں بردار ہوئے اور (تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے) تو ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو جانا۔

اس آیتِ جلیلہ میں یہ بصیرت افروز دلیل دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس لیے اپنے بندوں کا ولی یا سرپرست و کارساز بننے کا حقدار ہے اور دوسرا کوئی نہیں ہے کہ ایک تو وہ آسمانوں اور زمین کا موجد و خالق اور منعم و محسن ہے، دوسرے، وہ سب کو روزی دیتا ہے، کیونکہ سب اس کے محتاج و پروردگار ہیں اور وہ خود اس سے بے نیاز ہے۔ ظاہر ہے جو ہستی خود محتاج و پروردہ ہو، وہ دوسروں کی کارساز و سرپرست کیسے ہوسکتی ہے؟ اس ضمن میں مولانا مودودیؒ کی تشریح بھی قابلِ مطالعہ ہے:

"اس میں ایک لطیف تعریض ہے۔ مشرکوں نے اللہ کے سوا جن جن کو اپنا خدا بنا رکھا ہے وہ سب اپنے ان بندوں کو رزق دینے کے بجائے اُلٹا ان سے رزق پانے کے محتاج ہیں۔ کوئی فرعون خدائی کے ٹھاٹھ نہیں جا سکتا جب تک اس کے بندے اسے ٹیکس اور نذرانے نہ دیں۔ کسی صاحبِ قبر کی شانِ معبودیت قائم نہیں ہوسکتی جب تک اس کے پرستار اس کا شاندار مقبرہ تعمیر نہ کریں۔ کسی دیوتا کا دربارِ خداوندی سج نہیں سکتا جب تک اس کے پجاری اس کا مجسمہ بنا کر کسی عالی شان مندر میں نہ رکھیں اور اس کو تزئین و آرائش کے سامانوں سے آراستہ نہ کریں۔ سارے بناوٹی خدا

بے چارے خود اپنے بندوں کے محتاج ہیں۔ صرف ایک خداوندِ عالم ہی وہ حقیقی خدا ہے جس کی خدائی آپ اپنے بل بوتے پر قائم ہے اور جو کسی کی مدد کا محتاج نہیں، بلکہ سب اسی کے محتاج ہیں (تفہیم القرآن، ۱: ۵۴۷ - ۵۴۸، نوٹ ۱۰)۔

۲۔ سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ باطل پرستی یا اولیاء پرستی کو شرک اور شرک کو ظلم، وحدتِ اُمّت کا دشمن اور تفرقہ و تحزّب کا سبب قرار دیتا ہے اور انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب افرادِ نسلِ انسانی کو ایک اُمّت بنا دیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ اس نے انسان کی آرزو و مرضی کے مطابق اُسے فکر و نظر اور قول و فعل کی آزادی دے رکھی ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس آزادی کا صحیح استعمال کرتے ہیں، انہیں وہ اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے، اور یہ صالح لوگ "اللہ مہربان گل مہربان" کے مقولے کے مصداق بن جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جو لوگ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہیں اور شرک کرنے لگتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کو، جو ولیِ برحق ہے، چھوڑ کر دوسروں کو سرپرست و کارساز (= اولیاء) بنا لیتے ہیں، وہ حقیقت میں ظالم ہوتے ہیں۔ قدرت کا قانونِ مجازات یہ ہے کہ ظالموں کا نہ تو خدا تعالیٰ اور نہ اس کے بندے ہی ولی و مددگار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اپنا سرپرست و کارساز (= ولی) بنانا اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ فقط وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہی ہر چیز کرنے پر قدرت رکھتا ہے (الشوریٰ ۴۲: ۸-۹)۔

۳۔ اسی سورہ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ○ (الشوریٰ ۴۲: ۶)۔ جن لوگوں نے اُسے (یعنی اللہ تعالیٰ کو) چھوڑ کر اپنے دوسرے سرپرست و کارساز بنا رکھے ہیں، اللہ ہی ان پر نگراں ہے۔ تم ان کے ذمے دار نہیں ہو۔

اس آیتِ جلیلہ میں ان لوگوں کے لیے سخت وعید ہے جو ربِّ ذوالجلال والاکرام کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں کو اپنے سرپرست وکارساز (= اولیآء) بنا لیتے ہیں۔ ان "اولیآء" کو تو اپنے پرستاروں کے احوال و دُعا کی خبر تک نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرح نہ تو عالم الغیب والشّہادۃ، سمیع وبصیر، عزیز و قدیر اور مجیب الدّعوات ہی ہوتے ہیں اور نہ ہو سکتے ہی ہیں، البتہ مشرک مجرموں کی حیثیت ہیں اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہوتے ہیں۔ اس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ ربِّ جلیل کی نظر میں ان کا یہ مشرکانہ فعل انتہائی سنگین جرم اور ظلمِ عظیم ہے، لہٰذا اس قسم کے کسی فعل سے نہ تو صرفِ نظر کیا جائے گا اور نہ اسے معاف ہی کیا جائے گا۔ اس سے ان مشرکوں کو، جو اپنے آپ کو مسلمان اور توحید کے علمبردار کہتے اور سمجھتے ہیں اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری ہستیوں کو اپنے اولیآء بناتے ہیں، عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ لیکن وہ عبرت حاصل نہیں کرتے، کیونکہ وہ اکابر پرستی کی وجہ سے اسے شرک ہی نہیں سمجھتے۔ ظلم وجہل کی حد تو یہ ہے کہ وہ اپنے اس مشرکانہ فعل کو، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبولؐ کی نظر میں ظُلمِ عظیم ہے، عبادت سمجھ کر کرتے اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے ظلوم وجہول لوگوں میں نہ تو اصلاحِ حال کی اور نہ توبہ کی آرزو پیدا ہو سکتی ہے اور نہ انھیں اس کی توفیق ہی ہوتی ہے۔

تاریخِ ادیانِ عالم سے اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ انسان ہر زمان و مکان میں توحید کا مدّعی اور شرک کا منکر رہا ہے، اور یہ تاریخی واقعیت اس بات کا ثبوت ہے کہ توحید معروف اور شرک منکر ہے۔ بالفاظِ دیگر، توحید دینِ فطرت اور حق ہے، بخلاف اس کے شرک وضعی و باطل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان شرک کو بُرا سمجھتا ہے اور باوجود شرک کرنے کے اپنے آپ کو مشرک کہلانا پسند نہیں کرتا، اور اس الزام سے بچنے کی خاطر وہ اپنے مشرکانہ افعال و رسوم کی مختلف تاویلیں اور

توجیہات کرتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حقیقت کے باوجود کہ انسان شرک کا منکر ہے اور اسے گناہِ کبیرہ اور ظلم عظیم سمجھتا ہے، کیا وجہ ہے کہ وہ پھر بھی شرک کرتا ہے اور برملا کرتا ہے؟ قرآنِ حکیم نے جابجا مختلف پیرایوں میں اس کی توجیہہ کی ہے، لیکن سورۂ زمر میں مشرکین کے جواب کو نقل کیا ہے جو وہ عموماً دیا کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے جواب کی باطلیت اور دینِ خالص کی صراحت بھی کر دی ہے۔

"یہ کتاب (= قرآنِ مجید) اللہ تعالیٰ کی، جو غالب و زبردست اور دانا و بینا ہے، نازل کردہ ہے۔ (اے محمدؐ!) یہ کتاب ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے (یعنی اس میں ثبات و دوام، صداقت و مقصدیت اور افادیت ہے)؛ لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، دین (یعنی اپنے معتقدات و نظریات، جذبات و تمنیات اور نیات و اعمال) کو اس کے لیے (شرک و باطل کی آمیزش سے) پاک و صاف کرتے ہوئے۔ گوشِ ہوش سے سنو! خالص دین (یعنی شرک و باطل سے منزہ و مطہر دین) صرف اسی کے لیے ہے (یعنی اللہ تعالیٰ خالص یعنی ہر قسم کے کھوٹ سے پاک دین کا سزاوار ہے اور جس دین میں شرک و باطل وغیرہ کی ملاوٹ ہو، وہ اس کے لیے نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے، انسان کی عبادت، قربانی، زندگی، موت وغیرہ وغیرہ سب صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہونی چاہیئے)۔ چنانچہ جو لوگ اس کے سوا دوسروں کو اپنا اولیاء (یعنی سرپرست و کارساز بناتے ہیں (اور اس طرح دین میں شرک و باطل کا کھوٹ ملا دیتے ہیں، اور اس اعتراض سے بچنے کی خاطر وہ اپنے اس مشرکانہ فعل کی اس طرح تاویل بالباطل کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ تک ہماری رسائی کرا دیں۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ان کے درمیان ان تمام باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکرِ حق ہو

(الزّمر ۳۹: ۱تا ۳)۔

آزری طبقے ہر زمانے میں تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے ابلیسی فنون کے ذریعے ضعیف الاعتقاد لوگوں کو یہ جالیاتی فریب دینے میں کامیاب رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور اس کے حضور اپنی التجاؤں، فریادوں اور دعاؤں کو پیش کرنے اور قبول کرانے کے لیے برگزیدہ ہستیوں کو اولیآء اور وسیلہ بنانے کی حاجت ہوتی ہے، لہٰذا پہلے ان کی محبت میں فنا ہونا یا فنافی الشیخ ہونا، یا بالفاظِ دیگر ان کی حمد و ثنا اور پرستش و بندگی کرنا ناگزیر ہے۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ جس طرح کسی بادشاہ کے دربار میں رسائی حاصل کرنے یا اس کے پاس عرضداشت پیش کرنے کے لیے اہلِ دربار کی مدد و سفارش کی حاجت ہوتی ہے، اسی طرح (توبہ نعوذ باللہ) بندوں کو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے یا اس کی بارگاہ میں اپنی عرضداشت پیش کرنے کے لیے اولیآء اللہ کے وسیلے کی حاجت ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ (خاکم بدہن) نہ تو سمیع و بصیر، علیم و حکیم ہے اور نہ مستجیب الدّعوات ہے؛ نیز نہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے نہ لَا کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ اور نہ سبحان و صمد اور عزیز و قدیر ہی ہے۔ علاوہ بریں، وہ بندوں کی طرح سفارش پسند حکمران ہے اور اس کی خدائی میں اس کے بندے بھی شریک ہیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ظلوماً جہولاً کہا ہے اور ساتھ ہی اس حقیقت کی طرف بلیغ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ (الحجّ ۲۲: ۷۴): انہوں نے اللہ کی ایسی قدر نہیں کی جیسی اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور اور زور آور ہے۔

وسیلے کے نام پر بطل پرستی عالمگیر ہے اور اس کے ذریعے شرک و بت پرستی کا بازار گرم ہے۔ محولہ بالا آیاتِ جلیلہ میں اللہ تعالیٰ نے اولیآء سازی یا بطل پرستی کو شرک اور اس کے کرنے والوں کو کذاب و کفار قرار دیا ہے۔ ان سے مزید تین نتائج کا استنباط کر سکتے ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین وہ ہے جو کفر و شرک اور

کذب و باطل کی ہر آمیزش سے پاک وصاف ہو۔ دوسرے، اُسے ایسا ہی خالص دین پسند ہے؛ اور تیسرے، اللہ تعالیٰ کی عبادت مخلص بندوں کی طرح کرنی چاہیے اور خالص عبادت ہی مقبول ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مثبت و حسین اثرات انسان کی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں، جو اسے صاحبِ حُسن و سُرور بناتے ہیں۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ ناخالص عبادت، یعنی ایسی عبادت جس میں شرک و اولیاء پرستی اور کذب و باطل کا کھوٹ ہو، اللہ تعالیٰ کی نظر میں عبادت ہی نہیں، اور مشرکوں کی زندگی پر اس کے منفی و قبیح اثرات مرتب ہوتے ہیں، جو انہیں اہلِ نار بناتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ربِّ جلیل کے نزدیک صرف دینِ توحید ہے، جو ہر قسم کے شرک و بت پرستی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) سے پاک وصاف ہو، اور اسے وہ خالص دین سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے بندوں کو یہ دینِ توحید اختیار کرنے پر کثرت سے زور دیتا ہے۔ چنانچہ سورۂ زُمر میں وہ اپنے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک وحق گو سے کہلواتا ہے:

(اے نبیؐ) کہہ دیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت اس کے لیے دین (= اپنے عقائد و اعمال) کو شرک و باطل کی آمیزش سے پاک وصاف کر کے کروں (۳۹: ۱۱)۔

(پھر یہ بھی) کہہ دیجیے کہ میں اللہ کی عبادت اس کے لیے دین کو شرک و باطل کے کھوٹ سے پاک وصاف کر کے کرتا ہوں، تم اس کے سوا جس کی چاہو عبادت کرو۔ کہہ دیجیے کہ حقیقت میں زیاں کار (نقصان پذیر) وہ لوگ ہیں جنہوں نے قیامت کے دن اپنے آپ اور اپنے اہل وعیال کو گھاٹے میں ڈال دیا۔ یاد رکھو! یہی کھلا خسارہ ہے۔ (اس خسارے کی ماہیت یہ ہے کہ) ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں گے اور ان کے نیچے بھی سائبان ہوں گے۔ اس ذکر کے ساتھ

اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ اے میرے بندو! میرا تقویٰ اختیار کرو (یعنی میری طلب و جستجو کرو اور میرے قانونِ مکافات سے ڈرو)۔ جن لوگوں نے طاغوت کی عبادت (یعنی غیر اللہ کی بندگی) سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا، ان کے لیے خوشخبری ہے۔ پس (اے نبیؐ) میرے ان بندوں کو خوشخبری دے دو جو باتوں کو (گوشِ حق نیوش سے) سنتے ہیں اور ان کے بہترین پہلو کا اتباع کرتے ہیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی اہلِ عقلِ سلیم ہیں (الزمر ۳۹: ۱۴-۱۸)۔

ان آیاتِ جمیلہ سے مندرجۂ ذیل نتائجِ عشرہ مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ خالص دین کا مطلب دینِ توحید ہے اور وہی اصل اور اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے اور اس نے صرف اسی دین کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

۲۔ عبادت صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ کی کرنی چاہیے؛ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ یہ ظلم و جہل اور شرک و طاغوت پرستی ہے۔

۳۔ زیاں کار و نقصان پذیر لوگ اصل میں وہ ہیں جو شرک و بت پرستی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) کرتے ہیں۔

۴۔ خسارہ اصل میں آخرت کا خسارہ ہے، لہٰذا اہلِ نار ہی حقیقت میں زیاں کار و نقصان پذیر ہیں۔

۵۔ شرک بت پرستی کا نتیجہ عذاب النار ہے۔

۶۔ دین کی اصل تقویٰ ہے، اللہ تعالیٰ کی طلب و جستجو اور اس کے قانونِ مکافات کا خوف۔

۷۔ اللہ تعالیٰ شرک و بت پرستی سے بچنے اور کنارہ کش ہونے والوں کے لیے مژدۂ جنت دیتا ہے۔

۸۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ باتوں کو گوشِ حق نیوش سے

سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین باتوں پر عمل کرتے ہیں ۔

۹۔ ایسے ہی لوگ حقیقت میں ہدایت یافتہ اور

۱۰۔ اہلِ عقل سلیم ہوتے ہیں ۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ مشرکین حقیقت میں ظالم و جاہل، زیاں کار و نقصان پذیر اور محروم و اہلِ نار ہوتے ہیں ۔ بخلاف اس کے موحدین ہی متقی و صالح، دانشمند و ہدایت یافتہ اور کامیاب و اہلِ جنّت ہوتے ہیں ۔

سورہ المؤمن میں اللہ تعالیٰ آپؐ سے ارشاد فرماتا ہے :

قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ---- لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥ (المؤمن ۴۰ : ۶۶) :

اے پیغمبرِ اعظم و آخرؐ ! ان لوگوں سے کہہ دو کہ مجھے اُن کی عبادت یعنی پرستش و بندگی سے منع کیا گیا ہے، جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو (یعنی ان سے امداد اور مرادیں مانگتے ہو) ۔ درآنحالیکہ میرے پاس میرے ربّ کی طرف سے روشن دلائل و براہین آچکی ہیں ۔ نیز مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں کُل جہانوں کے پروردگار و مالک کی فرماں برداری کروں ۔

ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بھی متنبہ کر دیا ہے جو اس کے رسول و کتاب کی باتوں کی قولاً یا فعلاً تکذیب کرتے ہیں ۔ اندازِ انذار دیکھیے :

اَلَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَ ...... مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِیْنَ ٥ (المؤمن ۴۰ : ۷۰-۷۶) :

جو لوگ اس کتاب (= قرآنِ مجید) کو اور ان کتابوں کو جھٹلاتے ہیں جو ہم نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ بھیجی تھیں، عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، جن سے پکڑ کر وہ کھولتے ہوئے پانی کی طرف کھینچے جائیں گے اور پھر آگ میں جھونک دیے جائیں گے ۔ پھر ان سے پوچھا جائے گا کہ اب

کہاں ہیں اللہ کے سوا وہ دوسرے معبود و خدا جن کو تم شریک کرتے تھے ؟ ان کا جواب ہوگا : وہ ہم سے کھوئے گئے (اصل یہ ہے کہ وہ کھوئے نہیں گئے وہ تو حقیقت میں کچھ بھی نہیں تھے) بلکہ ہم اس سے پہلے کسی (حقیقی) چیز کو پکارتے ہی نہ تھے۔ اس طرح اللہ کافروں کا گمراہ ہونا متحقق کر دے گا۔ اُن کو جتایا جائے گا : تمہارا یہ انجام اس لیے ہوا ہے کہ تم زمین میں غیر حق پر مگن تھے اور اس پر اتراتے تھے۔ اب جاؤ ! جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، جہاں ہمیشہ تم کو رہنا ہے، بہت ہی برا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا۔

ان آیاتِ جلیلہ میں تین حقائق خاص طور سے قابلِ غور اور عبرت انگیز ہیں :

اولاً ، مشرک لوگ ہی حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور کتابوں کو جھٹلانے والے ہوتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔

ثانیاً ، اس وقت ان پر یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو وہ دنیا میں خدا سمجھ کر پکارتے تھے، وہ حقیقت میں خدا تھے نہ معبود، کچھ بھی نہیں تھے۔ وہ تو محض اسم بے مسمیٰ تھے۔

ثالثاً ، مشرک حقیقت میں کافر اور متکبر ہوتے ہیں اور کفر و تکبر کا انجام دوزخ کا رسوا کن عذاب ہے۔

قرآنِ مجید کی رُو سے مشرک لوگ چاہے مسلمان، اہلِ کتاب یا کفار ہوں، جن ہستیوں کو اپنے اولیاء یا کارساز و مددگار بناتے، ان کو مدد کے لیے پکارتے اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں، ان کو اس کی خبر تک نہیں ہوتی۔ دوسرے جملہ عباد الرحمٰن چاہے انبیاء علیہم السلام ہوں یا صدیقین، شہداء اور صالحین وہ تو دنیا میں آتے ہی شرک کو مٹانے اور توحید کو دین کے ہر شعبے میں غالب کرنے کے لیے۔ لیکن انسان کے ظلم و جہل کی حد یہ ہے کہ ان موحد اور توحید کے داعی و علمبردار ہستیوں کے نام نہاد متبعین و پرستار اپنے مشرکانہ عقائد و اعمال کو ان برگزیدہ ہستیوں کی تعلیمات سے منسوب کرتے اور شرک و

غلو فی الدین کو عبادت سمجھ کر کرتے اور اجرِ حسنہ کی امید رکھتے ہیں۔ غور کریں تو مشرکانہ عقائد و اعمال سے لازم آتا ہے کہ مشرکین جن ہستیوں کو پکارتے ہیں، ان کو وہ اپنے معبود و ربّ، یعنی رازق و حاجت روا، دستگیر و مشکل کشا، دستگیر و کارساز، حیّ و قیوم، سمیع و بصیر، حاضر و ناظر، عزیز و قدیر، مجیب الدعوات یعنی صفاتِ الٰہیہ کے مالک مانتے ہیں۔ اگر یہ کفر نہیں تو پھر کفر کسے کہتے ہیں؟ بقول علامہ اقبال

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

قرآنِ مجید کی رو سے انسان کے اس ظلم و جہل کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موضوعی۔ معروضی یا نفسی۔ ابلیسی شیطان ہر قسم کے قبیح مشرکانہ عقائد و اعمال کو اپنی جالیاتی فریب کاری وسوسہ اندازی کے ذریعے حسین بنا کر دکھاتا ہے اور انسان جو طبعاً حُسن پسند ہے، اس جالیاتی دھوکے میں مارا جاتا ہے۔ ربِّ رحیم شیطان کے اس جالیاتی فریب کی قلعی کھولنے اور انسان کو اس سے محفوظ رکھنے، نیز شرک کی نفی اور توحید کے اثبات کی خاطر اُسے ایک بصیرت افروز واقعیت سے آگاہ کرتا ہے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ...... نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيرًا ۝ (الفرقان ۲۵: ۱۷ تا ۱۹):

اور (جزا و سزا کے فیصلے کے) دن اللہ تعالیٰ ان (مشرک و باطل پرست) لوگوں کو بھی اور ان (معبودوں) کو بھی جن کی یہ اللہ تعالیٰ کے سوا پرستش و بندگی کرتے تھے، یکجا جمع کرے گا اور پھر ان سے پوچھے گا: کیا تم نے میرے بندوں کو گمراہ کردیا تھا یا وہ خود ہی (توحید کی راہِ راست سے) بھٹک گئے تھے۔ وہ عرض کریں گے: شرک و نقص سے پاک و منزّہ ہے تیری ذات! ہماری کیا مجال تھی کہ ہم تیرے سوا کسی اور کو اپنا کارساز و مولیٰ بناتے۔ ہوا یہ کہ تو ان کو اور ان کے آباؤ اجداد کو مال دیتا رہا،

یہاں تک کہ وہ (تیرے ذکر اور نصیحت کو) بھول گئے اور وہ ہلاک و برباد ہونے والے لوگ تھے۔ اس طرح وہ بھی تمہارے معبود تمہاری ان ساری باتوں کو جھٹلا دیں گے جو آج کہہ رہے ہو۔ (اس کا انجام یہ ہوگا کہ) پھر تم عذاب کو نہ تو ٹال سکو گے اور نہ کہیں سے مدد ہی پا سکو گے۔ (یاد رکھو!) جو بھی تم میں سے ظلم کرے گا، ہم اسے بہت بڑے عذاب کا مزا چکھائیں گے (نیز دیکھیے سبا ۳۴: ۴۰-۴۱؛ المائدة ۵: ۱۱۶ تا ۱۱۸)۔

ان آیاتِ جلیلہ کے ذریعے ربِّ جلیل ہمیں اس اصلِ عظیم سے آگاہ کرتا ہے کہ کوئی نبی یا رسول علیہ السلام نہ خود شرک کر سکتا ہے اور نہ دوسروں کو شرک کی دعوت دے سکتا ہے۔ یہ ان کی شانِ نبوّت و رسالت کے خلاف ہے۔ شرک ایسے ظلمِ عظیم کے ذمے دار خود مشرک ہوتے ہیں اور عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں جو مال و دولت کے نشے میں بدک کر اللہ تعالیٰ کو بھلا دیتے ہیں اور بجائے اس کے غیر اللہ (مثلاً دولت، شہرت، زمین، عورت، اقتدار، حکومت، مظاہرِ فطرت، مقامات، زندہ و مردہ شخصیات، اَبطال، نبیؑ، رسولؐ) کو اپنا ولی و معبود بنا کر اس کی عبادت یعنی حمد و ثنا اور بندگی و پرستش کرنے لگتے ہیں۔ چونکہ مشرک و بُت پرست اپنے مشرکانہ عقائد و افعال کا جواز پیدا کرنے کی خاطر انہیں برگزیدہ ہستیوں کی تعلیمات و اُسوۂ حسنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ جو عالم الغیب والشہادۃ ہے مشرکوں کو اس حقیقت سے آگاہ و متنبّہ کرتا ہے کہ روزِ حساب ان کے اولیآء اور معبود ان کے دعوے اور عمل کی تکذیب و تردید کریں گے اور اس کے حضور اپنے اس ایمان کا اظہار و اعتراف کریں گے کہ "ہماری کیا مجال تھی کہ ہم اپنے اِلٰہ و ربّ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا مولیٰ و کارساز بناتے؟ مشرک تو خود بہک اور بھٹک گئے تھے۔"

چونکہ شرک سب سے زیادہ سنگین اور ناقابلِ معافی گناہ ہے، لہٰذا وہ ہر طرح کی مثالوں سے انسان کو سمجھانے اور شرک سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیاتِ جلیلہ پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّیْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ۝ .... وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۝ (الزُّمر ۳۹ : ۶۴ تا ۶۷)۔

(اے نبیؐ!) کہہ دو! اے جاہلو! کیا تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں غیر اللہ کی عبادت کروں؟ (حقیقت یہ ہے کہ) تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے انبیاءؑ کی طرف یہ وحی بھیجی گئی تھی کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے؛ لٰہذا تم بس ایک اللہ ہی کی پرستش و بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں سے ہو جاؤ۔ (حق یہ ہے کہ مشرکوں نے) اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسی سورت میں اپنے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے فلسفۂ توحید کے بعض ادلیں فکر انگیز و ایمان افروز حقائق کو اس طرح بیان کیا ہے:

۲۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ..... عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ (الزُّمر ۳۹ : ۳۶۔۳۸)؛

کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟ اور یہ لوگ تمہیں اس کے سوا دوسروں سے ڈراتے ہیں؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ جسے (اس کے شرک و ظلم کی پاداش میں) گمراہ کر دے، اُسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں، اور جسے اللہ ہدایت دے اُسے گمراہ کرنے والا کوئی نہیں۔ کیا اللہ زبردست اور (ظالموں سے) انتقام لینے والا نہیں؟

اگر تم ان لوگوں سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے؟ تو یہ خود کہیں گے اللہ نے۔ کہو! کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اگر اللہ مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو کیا وہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اس کے نقصان سے بچا لیں گے؟ یا اگر اللہ مجھ پر رحمت یعنی احسان و کرم کرنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکیں گے؟ بس

ان سے کہہ دو کہ اللہ ہی میرے لیے کافی ہے۔ توکل کرنے والے اسی پر توکل کرتے ہیں۔
شرک، باطل پرستی اور اصنام پرستی کے بنیادی عوامل و محرکات میں سے ایک عقیدۂ شفاعت ہے، جو ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزردوں نے اسے دین کا جزو لاینفک بنا دیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ ہر دین میں ایسے فرقے پائے جاتے ہیں، جو اپنی نجات کو غیر اللہ کی شفاعت پر منحصر سمجھتے ہیں اور ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے، فحشاء و منکرات ظلم و استحصال اور جرم و گناہ کرنے کی ترغیب ملتی ہے۔ اہلِ کلیسا نے تو عقیدۂ شفاعت کو اپنی دین کی اساس ہی بنا لیا ہے۔ چنانچہ اس عالمگیر عقیدۂ شفاعت کا نتیجہ ہے کہ ہر دین میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنھوں نے اپنے شفیع یا سفارشی بنا رکھے ہیں، اور اس بنا پر ان کی حمد و ثنا اور پرستش و بندگی (= عبادت) کرتے ہیں۔ قرآنِ مجید نے اس عقیدۂ شفاعت کا ہر رنگ میں بطلان کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس عقیدے سے ایک تو اس سے قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل کی، دوسرے عقیدۂ یوم الدین کی، تیسرے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عدل و صمدیت و سبحانیت کی اور چوتھے عقیدۂ توحید یعنی اس کی صفتِ وحدہٗ لاشریک کی نفی ہوتی ہے، نیز اس عقیدے سے اللہ تعالیٰ کو، جو عادل و حکیم، عزیز و قدیر، جلیل و کبیر، جبّار و قہّار اور سبحان و صمد ہے۔ اس کی ان صفاتِ حسنہ سے معرّا اور اس دنیا کے خود پسند و خوشامد پسند، عدل و آئین سے بے نیاز اور مطلق العنان حکمران ماننا لازم آتا ہے، جو صریحاً کفر ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید اس عقیدۂ شفاعت کی نفی و تردید باندازِ استفہام اس طرح کرتا ہے:

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ..... ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ (الزمر ۳۹: ۴۳-۴۴)۔

کیا لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو شفیع یا سفارشی بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو! کیا وہ شفاعت کر سکتے ہیں؟ اگر ان کے اختیار میں کچھ بھی نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی

نہ ہوں۔ کہہ دو کہ شفاعت کُل کی کُل اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

ان آیاتِ جلیلہ میں اللہ تعالیٰ نے عقلِ انسانی سے خطاب کیا ہے کہ وہ ایک طرف آسمانوں اور زمین کے خالق و مالک اور حکمران و ربّ کی عظمت و کبریائی اور صمدیت و قدرت کا تصور کرے اور دوسری جانب اس کے بندوں کے فقر و بے اختیاری پر غور کرے تو لامحالہ وہ اس نتیجے پر پہنچے گی کہ کسی بندے کو خواہ وہ کتنی برگزیدہ ہستی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے حضور کسی کی شفاعت کرنے کی قطعاً مجال نہیں، البتہ اس کا اذن ہوگا اور جس کے حق میں ہوگا تو اس کی برگزیدہ ہستی شفاعت کرے گی، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیتِ جمیلہ سے ثابت ہوا:
مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ...... (البقرہ ۲۵ : ۲۵۵) : کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے؟ (یعنی کوئی نہیں ہے)۔

اس استفہامِ انکاریہ سے ان تمام شرکانہ عقائد کی نفی ہو جاتی ہے، جو ادیانِ عالم میں پائے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے برگزیدہ بندوں کو شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرمائے گا، مگر ان کے حق میں، جو اس کی نظر میں مستحق ہوں گے، اور اس کا علم صرف عالم الغیب والشہادۃ کو ہے، لیکن اس بات کا اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے فیصلہ کر دیا ہے کہ ظالموں کا کوئی مخلص دوست ہوگا نہ شفیع یا سفارشی: مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ۝ (المؤمن ۴۰: ۱۸) : ظالموں کا نہ کوئی ولی دوست ہوگا اور نہ کوئی شفیع، جس کی بات مانی جائے۔

عقیدۂ شفاعت اس اعتبار سے انتہائی خطرناک ہے کہ اس سے ایک تو انسان کو قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل، یوم الدّین اور عذاب النّار کا خوف نہیں رہتا، اور دوسرے، اس کو کفر و شرک، جرم و گناہ، ظلم و استحصال، فسق و فجور اور فحشاء و منکر کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔

توحید و تکریمِ انسانی

عقیدۂ توحید کے ہیولے میں تکریمِ انسانی مضمر ہے۔ دلیل یہ ہے کہ اس عقیدے کی رُو سے سب بنی نوع انسان اصلاً و نسلاً ایک ہیں اور نفسِ واحدہ کی طرح ہیں، نیز اللہ تعالیٰ کے عیال، پروردہ اور بندے ہیں، اور تنہا وہی ان کا اِلٰہ و ربّ ہے۔ اس سے نسلی، الوانی، قومی، قبائلی، لسانی تفوّق و افضلیت کے نظریات اور عصبیت کا ابطال ہو جاتا ہے، چنانچہ اسی بنا پر قرآنِ مجید نے کسی قبیلے یا قوم سے متعلّق نہیں بلکہ کُل افرادِ نسلِ انسانی سے فرمایا: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ (الاسراء ۱۷: ۷۰): اور بلا شبہ ہم نے (جملہ) بنی آدم کو عزّت و بزرگی دی ہے۔

اِس آیتِ جمیلہ کی رُو سے اہلِ ایمان پر یہ حقیقت تسلیم کرنا لازم آتا ہے کہ ہر فردِ بشر واجب التکریم ہے۔ چنانچہ جو مسلمان کسی فردِ بشر کو اپنے سے کمتر یا ذلیل و حقیر سمجھتا یا اس کی تحقیر و تذلیل کرتا ہے، وہ صریحاً عقیدۂ توحید کی تکذیب اور اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کرتا ہے۔ یہ کتنی شرمناک و عبرتناک حقیقت ہے کہ انسان کی تحقیر و تذلیل جتنی مسلم معاشروں میں ہوتی ہے اتنی ہندو معاشرے کے سوا شاید ہی کسی معاشرے میں ہوتی ہو، حالانکہ مُسلم اقوام اپنے آپ کو نہ صرف موحّد بلکہ توحید کی داعی سمجھتی ہیں۔ پاکستان میں جو

توحید کے نام پر معرضِ وجود میں آیا ہے، بالخصوص محنت کشوں (اس اصطلاح کا مطلب مزارع، کسان، ہنرمند اور غیرہنرمند محنت کش، نیز وہ تمام لوگ ہیں جو محنت کر کے رزقِ حلال کماتے ہیں) کو حقارت سے "کمی" کہتے ہیں اور کاہل و مفت خور اہلِ ثروت، جاگیرداروں، بڑے بڑے زمینداروں، تاجروں اور صنعت کاروں کو معزز و مکرّم القاب سے یاد کرتے ہیں، مثلاً خوانین، سردار، وڈیرے، نواب، سیٹھ، میاں جی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب طبقے قارونی ہوتے ہیں اور محنت کشوں کو اپنا محکوم و غلام اور "شودر" سمجھتے اور ان سے انسانیت سوز سلوک کرتے ہیں، نیز ان کا استحصال کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ محنت کش نہ تو معاشرتی سرطانوں کے برابر بیٹھ سکتے، نہ ان کے ساتھ ایک دستر خوان پر کھانا کھا سکتے اور نہ ان کے برتنوں میں کھا پی ہی سکتے ہیں۔ ان کی حکم عدولی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب اپنی "رعایا" پر فرعونی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ان کا حاکم و مالک، مخدوم و مطاع اور داتا سمجھتے ہیں؛ نیز ان پر اس طرح حکم چلاتے ہیں، جیسے وہ اللہ تعالیٰ کے نہیں، ان کے بندے، عیال اور پروردہ ہوں۔ اصل یہ ہے کہ فرعونی، قارونی اور آزری سرطان اپنے علاقوں، جاگیروں اور کارخانوں وغیرہ میں بسنے یا کام کرنے والے مزارعوں اور دیگر محنت کشوں کے "خدا" بنے ہوتے ہیں اور ان کے سامنے بولنا یا ان کی حکم عدولی یا تعظیم و سلام نہ کرنا ناقابلِ معافی جرم سمجھا جاتا ہے، جس کی سزا بعض اوقات ایسی شدید اور گھناؤنی ہوتی ہے کہ روحِ شیطانی بھی کانپ اٹھتی ہوگی۔

یہ سرطانی طبقے انسان کی تکریم کرنے کے بجائے اس کی تذلیل و تحقیر اس لیے کرتے ہیں کہ توحید پر ایمان نہیں رکھتے۔ موحّد کبھی متکبّر نہیں ہوسکتا، لہٰذا وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور دوسروں کو اپنے سے چھوٹا نہیں سمجھ سکتا اور نہ ان کی تحقیر و تذلیل ہی کر سکتا ہے۔ توحید سے انسانی اخوّت و مساوات اور آزادی و تکریم کا پاس و احترام لازم آتا ہے، لیکن دینِ توحید محکومی و غلامی، زرکاری و بردہ فروشی اور کنیز داری و تحقیرِ انسانی

کی ہرگز اجازت نہیں دیتا، بلکہ اسے ظلم عظیم و جرم سنگین اور گناہِ کبیرہ قرار دیتا ہے۔ علاوہ بریں سچا موحد کبھی فرعون و ہامان اور قارون و آذر نہیں بن سکتا اور نہ ان کی طرح بنی نوع انسان پر ظلم و ستم یا جور و جفا، نیز نہ ان کا استحصال اور ان کے حقوق سلب ہی کر سکتا ہے۔

علاوہ بریں موحد ہر حال میں لوگوں کی عزت و ناموس اور مال و دولت کا محافظ ہوتا ہے؛ وہ نہ تو کسی کی عزت و ناموس سے کھیلتا اور نہ کسی کی عزتِ نفس کو مجروح ہی کرتا ہے۔ وہ آذروں کی طرح نہ تو مسندِ ارشاد پر بیٹھتا ہے اور نہ اپنے تلامذہ، عقیدت مندوں اور خدّام کو اپنے سامنے سرنگوں ہونے یا جبّہ سائی کرنے کی اجازت ہی دیتا ہے۔ وہ تو اس انسانیت سوز نظّارے کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ الغرض، وہ معاشرتی سرطانوں کی طرح فرعونی، ہامانی اور قارونی و آذری کرنے کا تصوّر تک نہیں کر سکتا، اس لیے کہ وہ اولادِ آدم کی تکریم، عزتِ نفس، آزادی اور حقوقِ انسانی کا نقیب و محافظ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ حقیقی مجاہد ہوتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عقیدۂ توحید کی رُو سے اللہ تعالیٰ جملہ نسلِ انسانی کا اِلٰہ و ربّ ہے اور وہ سب نسلاً و اصلاً ایک ہیں اور انسان کی حیثیت سے سب واجب التکریم ہیں، اس لیے کہ وہ ربِّ کریم کی جمالیاتی، تدریجی تخلیقی فعالیت کے شاہکار ہیں۔ اگرچہ اُمّتِ مسلمہ سب اقوامِ عالم سے زیادہ اپنے آپ کو موحِد اور توحید کی داعی سمجھتی ہے لیکن غیر مسلم معاشروں کے مقابلے میں مسلم معاشروں میں محنت کشوں اور بے سہارا انسانوں، مثلاً یتیموں اور مسکینوں یا اہلِ احتیاج کی تذلیل و تحقیر غالباً سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دَور کے مسلمان صرف نام کے موحِد ہیں۔ بہر حال مسلم معاشروں میں یتیموں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ وہ اپنے ربّ کی دیگر نعمتوں کی طرح ابنائے جنس کی شفقت و محبت کو ترستے رہتے ہیں۔ ان کی عزّتِ نفس مجروح ہوتی رہتی ہے اور ان میں احساسِ تنہائی و کمتری پرورش پاتا رہتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ان کی خودی اور خدا داد

صلاحیتوں کا نشوونما و ارتقا نہیں ہو پاتا۔ اس حقیقت سے بہت کم آشنا ہیں کہ کسی انسان کو محبت و شفقت، اور رزق و نعم سے محروم رکھنا، اس کی خودی کی نشوونما نہ ہونے دینا اور اس کی عزتِ نفس کو گھائل کرنا، ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نظر میں ایسا ظلمِ عظیم اور گناہِ کبیرہ ہے، جس کی پاداش میں وہ قوم خود بھی ذلّت و مسکنت کی شکار ہو جاتی ہے۔ یہ اہل الاصول قرآنِ مجید کی زبان میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

"انسان کا حال یہ ہے کہ جب اسے اس کا ربّ کسی آزمائش میں ڈالتا ہے، پھر اسے عزّت و نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے ربّ نے مجھے معزّز بنا دیا ہے۔ اور جب اُسے امتحان میں ڈالتا ہے اور اس کی روزی اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے ربّ نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں۔ (اللہ تعالیٰ کسی کو ذلیل نہیں کرتا بلکہ اس ذلّت و مسکنت کی وجہِ حقیقی یہ ہے کہ) تم یتیم کی عزّت و تکریم نہیں کرتے اور نہ مسکین طبقے کو ان کی روزی کا بندوبست کرنے کی ایک دوسرے کو ترغیب ہی دیتے ہو؛ نیز میراث کا سارا مال خود ہی سمیٹ کر ہضم کر جاتے ہو۔ اور مال و دولت سے بے پناہ محبّت کرتے ہو (الفجر ۸۹: ۱۵ تا ۲۰)۔

ان آیاتِ جلیلہ کی رُو سے توحید کے مندرجۂ ذیل بنیادی تقاضوں کو پورا کیے بغیر کوئی مسلمان سچّا مؤمن اور موحّد نہیں بن سکتا۔

تمام افرادِ نسلِ انسانی خصوصاً یتیموں اور بے سہارا لوگوں کی عزت و تکریم کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں معزّز و ذمّے دار شہری سمجھنا اور معاشرے میں دوسروں کے برابر عزّت و مکرمت کا مقام دینا؛ ان کے شہری و انسانی حقوق کا پاس و احترام کرنا؛ ان کی کفالت کا آبرو مندانہ بندوبست اور اس کے لیے پروپیگنڈا کرنا۔ اس سے مستنبط ہوا کہ ان تقاضوں کو پورا نہ کرنا، توحید کا عملاً انکار کرنا ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ایسی منکرِ توحید قوم خود بھی ذلّت و مسکنت کی شکار ہو جاتی ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ

اخذ کرنا درست نہیں ہوگا کہ ہماری ذلت و مسکنت اور احتیاج و دست نگری کا ایک بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم اپنی قوم کے بے سہارا اور مفلوک الحال افراد، نیز یتیموں اور مسکینوں کی نہ تو عزت و تکریم کرتے ہیں اور نہ ان کی روزی و روزگار اور بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کا کوئی معقول و آبرومندانہ بندوبست ہی کرتے ہیں؛ حتیٰ کہ ہم قومی کفالت کا نظام قائم کرنے کی تشہیر بھی نہیں کرتے۔ اس سے کیا یہ مستنبط نہیں ہوتا کہ ہم بحیثیتِ قوم و ملت توحیدِ عملی کے منکر ہیں، لہٰذا سچے مؤمن و موحّد نہیں؟ اگر یہ استنباط درست ہے اور یقیناً درست ہے، کیونکہ اسے جھٹلانے کی ہمارے پاس کوئی وجہِ جواز نہیں تو پھر بحیثیتِ قوم و ملت ہماری اوّلین ذمے داری اپنے معاشرے کو توحید کی اساس پہ استوار کرنا، اس میں احکامِ قرآنی کو نافذ کرنا اور ان پر عمل درآمد کرنا اور کرانا ہے۔ یہ ہے اسلامی معاشرہ۔ اس کی پہچان یہ ہے کہ اس میں سب انسان برابر، آزاد اور واجب التکریم ہوتے ہیں؛ سب کو انسانی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ عدل سب کو ملتا ہے، مفت اور بلاتاخیر ملتا ہے۔ اس میں کفالتِ قومی کا نظام ہوتا ہے، یعنی حکومت، رعایا کے روزگار، روزی اور ضروریاتِ زندگی (مثلاً تعلیم و تربیت، صحت و تندرستی، علاج معالجے، صفائی، ورزش، کھیل، سیر وغیرہ وغیرہ) کی ضامن ہوتی ہے۔ معاشرہ فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آزروں سے پاک و صاف، لہٰذا ان کی شر انگیزیوں، شرک کاریوں، ریشہ دوانیوں، سود کاریوں، ناجائز کارروائیوں، جفا کاریوں، اور ستم رانیوں وغیرہ وغیرہ، نیز خوف و حزن کے عذاب النار سے محفوظ و مصئون ہوتا ہے۔ الغرض، اسلامی معاشرہ محبت و رحمت، ایثار و قربانی، اخوت و مساوات، آزادی و احسان اور امن و سلامتی کی جنت ہوتا ہے۔

فصل - ۷

شرک کی تحلیلِ نفسی

فلسفۂ توحید و شرک پر غور کرنے سے اس اہم نفسیاتی نکتے سے آگاہی ہوتی ہے کہ شرک وہ لوگ کرتے ہیں جو خدا شناس ہوتے ہیں نہ خود شناس۔ انسان کو اگر اللہ جلّ شانہٗ کی عظمت و کبریائی، عزت و قدرت، صمدیت و سبحانیت، قہاری و جبروت، ربوبیت و رحمت، غفاری و بخشش اور جمال و جلال کا عرفان و ایقان ہو تو وہ اس کے سوا ہرگز کسی کو اپنا اِلٰہ و ربّ سمجھے نہ مانے گا، نیز اسے پکارے نہ اس کی بندگی کرے گا۔ عارف یا خدا آگاہ انسان کے شرک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تو شرک و بت پرستی کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ جو وحدہٗ لاشریک اور لَا کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ہے، سبحان و صمد اور قادرِ مطلق ہے، کسی کو اپنی ذات و صفات یا کاروبارِ خدائی میں اپنا شریک بنا سکتا ہے یا کوئی ہستی چاہے کتنی برگزیدہ کیوں نہ ہو، اس کی شریک ہو سکتی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ غنی اور ہر مخلوق اس کی فقیر یا محتاج و دست نگر ہے (فاطر ۳۵: ۱۵)۔ شرک ظلمِ عظیم و جہلِ مرکب ہے، لہٰذا ایک موحّد و عادل اور صاحبِ عقلِ سلیم انسان یہ لغو و محال بات سوچ بھی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ جو بے نیاز و احتیاج اور قادرِ مطلق ہے، اُسے اپنے بندوں کی اصلاح یا ان کی مغفرت کے لیے اپنی کسی مخلوق کے بطن میں بشر کی طرح پرورش پانے اور پیدا ہونے کی احتیاج ہو سکتی ہے؛ یا وہ خود بیٹا بن کر مصلوب ہونے یا اوتار بن کر جلا وطنی کی زندگی کرنے پر مجبور ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے فاسد و باطل اور جاہلانہ عقائد وہی لوگ

رکھ سکتے ہیں جو صفاتِ الٰہیہ کا شعور یا ان پر ایمان نہیں رکھتے۔

انسان کی ایک نفسیاتی کمزوری یہ ہے کہ وہ دینی عقائد کے بارے میں اکابر پرست و مقلد واقع ہوا ہے، لہٰذا وہ اپنی حسّی و قلبی قوتوں سے کام لینے کے بجائے عصبیت سے کام لیتا ہے۔ یہ مذہبی عصبیت شرک کا ایک انتہائی مؤثر عامل و محرّک ہے۔

خدا ناشناسی کی طرح خود ناشناسی بھی شرک کا ایک بنیادی عامل و محرّک ہے۔ انسان اگر اپنی ذات کے حوالے سے سوچے کہ اگر ہر بشر اپنی پیدائش و روزی، پرورش و نگہداشت، تعلیم و تربیت، نیز جملہ ضروریاتِ زندگی کے حصول اور بے خوف و خطر اور راحت و اطمینان سے زندگی بسر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ، اس کی نعمتوں اور اس کے بندوں کا اس قدر محتاج ہے کہ ان کے بغیر وہ انسان بن سکتا ہے نہ زندہ ہی رہ سکتا ہے، تو وہ کسی بشر یا کسی اور ہستی کو، چاہے وہ کتنی ہی برگزیدہ کیوں نہ ہو، اپنا اِلٰہ و ربّ مان سکتا نہ بنا ہی سکتا ہے۔ وہ تو ایسی مہمل و محال بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی ہستی بندہ و مخلوق اور محتاج و حادث ہو کر اِلٰہ و ربّ یا اس کی ذات و صفات اور بادشاہت میں شریک ہو سکتی ہے۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ نکلا کہ خدا شناس و خود شناس شخص صرف اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوتا ہے اور صرف اسی کی عبادت کرتا ہے؛ نیز اس کی زندگی و موت اور پرستش و قربانی صرف اسی کے لیے ہوتی ہے، لہٰذا وہ شرک کر سکتا نہ مشرک ہی ہو سکتا ہے۔ یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اُتنا سچا بھی ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ اس مقولے میں ہم اس قدر اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ جس شخص نے اپنی خودی و خدا کو پہچان لیا، وہ مؤمن و موحّد بن گیا۔ الغرض، اگر خودی و خدا کی معرفت کا خاصّہ توحید ہے تو فقدانِ معرفت سے شرک و اصنام پرستی لازم آتی ہے۔ قرآنِ مجید سے ثابت ہے کہ جب پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپؐ سے پہلے جملہ انبیاء علیہم السلام نے توحید کا نعرہ بلند کیا اور لوگوں کو توحید کی دعوت دی تو ان میں بالخصوص اُمرآء و روسآء، سرداروں جاگیرداروں اور اربابِ حکومت و اقتدار نے اس

کی پُرزور مخالفت کی؛ نیز تحریکِ توحید اور اس کے علمبرداروں کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس تاریخی واقعیّت میں توحید کی معنویت اور اس کے تقاضوں کی حقیقت پوشیدہ ہے جسے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سب سے پہلے ہم معلوم کریں گے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے اس کا مطلب کیا ہے؟ توحید کے دو کلمات ہیں، جو دراصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں اور وہ یہ ہیں:

۱۔ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ (محمّد ۴۷: ۱۹): اللہ کے سوا کوئی معبود یا خدا نہیں۔

۲۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف ۱۲: ۴۰)۔ حکم دینے اور حکمرانی کرنے کا سزاوار صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔

ان کلماتِ توحید میں لَا اور اِلَّا دو اساسی اہم علاماتِ توحید ہیں۔ لَا نفی کی اور اِلَّا اثبات کی علامت ہے؛ اور لَا کی اِلَّا پر تقدیم میں یہ حکمت مضمر ہے کہ جب تک شرک اور مشرکانہ قوّتوں کا استیصال نہیں ہوجاتا، توحید کا اثبات محال ہے۔ دُنیا میں چار بڑی مُشرکانہ قوّتیں ہیں: فرعون و ہامان اور قارون و آزر۔ چونکہ یہ چاروں قوّتیں انسان کی دشمن، خون آشام، رہزنِ حُسنِ زندگی اور غارتگرِ ایمان و توحید ہیں، نیز افرادِ نسلِ انسانی کے خون پر پرورش پاتی اور قوّت و اقتدار حاصل کرتی ہیں، اس لیے ہم نے ان کے لیئے "معاشرتی سرطانوں" کی تعبیر اختیار کی ہے۔

۱۔ اب ہم کلمۂ توحید لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس میں جُملہ ساختہ و خود ساختہ خداؤں اور معبودانِ باطلہ کی نفی کی گئی ہے، اور ساتھ ہی اس حقیقت کا اِثبات کیا گیا ہے کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی سب کا معبود اور خدا ہے۔ چونکہ کوئی ہستی خواہ کتنی برگزیدہ کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی مخلوق و پروردہ اور محتاج و دست نگر ہوتی ہے، لہٰذا وہ اِلٰہ و ربّ نہیں ہوسکتی اور نہ صفاتِ اِلٰہیہ کی مالک ہی ہوسکتی ہے؛ مثلاً وہ اللہ تعالیٰ کی طرح سمیع و بصیر، علیم و خبیر، عزیز و قدیر، حیّ و قیّوم اور مستجیب الدّعوات نہیں ہوسکتی۔ چونکہ اولیاء اللہ، بشمول انبیاء و رسل

اور صدیقین و شہدا، سچے ہوتے ہیں اور کبھی جھوٹ بول نہیں سکتے ، لہٰذا انہوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ معبود و خدا یا الٰہ و رب ہیں۔ وہ تو ظلم و جہل کی ایسی بات نہ تو کبھی سوچ سکتے، نہ کہہ ہی سکتے اور نہ اپنے متعلق سن ہی سکتے ہیں ، چنانچہ وہ نہ صرف اہلِ دُنیا کی دُعا و فریاد کو سُن نہیں سکتے اور نہ ان کی مدد ہی کر سکتے ہیں ، بلکہ قیامت کے دن ان "عاشقوں" ، پرستاروں اور پکارنے والوں کے شرک کا انکار کریں گے ، جیسا کہ مندرجۂ ذیل آیاتِ جلیلہ سے ثابت ہے:

" اللہ ہی تمہارا رب ہے ؛ اسی کی بادشاہت ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس کے سوا دوسروں کو پکارتے یا اُن سے دُعا مانگتے ہیں ، وہ تو ایک رائی کے بھی مالک نہیں یا ذرہ بھر اختیار نہیں رکھتے ۔ اگر تم ان کو پکارو تو وہ تمہاری دعاؤں کو سُن نہیں سکتے ۔ وہ سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے (یا دعاؤں کو قبول نہیں کر سکتے) ۔ اور قیامت کے دن تو وہ تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے ۔ حقیقت کی صحیح خبر تمہیں (ربِّ) خبیر کے سوا کوئی نہیں دے سکتا (فاطر ۳۵: ۱۳ تا ۱۴)۔

شرک کے بطلان پر دوسری دلیلِ محکم قرآنِ حکیم یہ لاتا ہے کہ " جملہ بنی نوعِ انسان (جن میں جملہ اولیاء اللہ ، برگزیدہ ہستیاں شامل ہیں) اللہ تعالیٰ کی محتاج و دست نگر ہیں اور اللہ غنی (=بے نیاز و بے احتیاج) اور حمید (= ستودہ بالذات) اور اپنے انعام و اکرام ، بخشش و نوالۂ رحمت و مغفرت ، جود و عطا کے سبب محمود ہے (فاطر ۳۵ : ۱۵) ۔

جب ہر ہستی ، چاہے کتنی برگزیدہ کیوں نہ ہو ، اللہ تعالیٰ کی محتاج و نیازمند ہے ، تو پھر کسی ہستی کو خدا یا ربّ ماننا ظلمِ عظیم ، جہلِ مرکب اور شرکِ جلی نہیں تو اور کیا ہے ؟ انسان کی ضلالت و شقاوت اور محرومی و نامرادی کی ایک وجہ یہ ہے کہ " جانتا ہے پر مانتا نہیں " ۔

انسان بلا شبہ فطرۃً جانتا ہے کہ فقط اللہ تعالیٰ ہی اس کا الٰہ و ربّ ہے اور اسی کی محبت کا بیج اس کے قلب میں مضمر اور نشوونما کے لیے بیقرار ہوتا ہے ، لیکن اپنے آباؤ اجداد ، اُن دروں ، دیگر معاشرتی سرطانوں اور مشرکوں کو شرک و صنم پرستی کرتے دیکھتا اور ان کی باتوں کو سنتا ہے تو بغیر جانے بوجھے اور سوچے سمجھے ان کی کورانہ تقلید کرنے لگتا ہے ، اس کے نتیجے

میں وہ ظالم و جاہل بن جاتا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ "اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں بنائے (الاحزاب ۳۳ : ۴) کہ بیک وقت اللہ اور غیر اللہ کو اپنا الٰہ و ربّ مانے، اور دونوں سے محبّت کرے ۔ چونکہ انسان ایسا نہیں کر سکتا ، لہٰذا مؤمن و موحّد کے دل میں صرف اللہ تعالیٰ کی شدید محبّت ہوتی ہے اور اسی کو وہ اپنا الٰہ و ربّ مانتا ہے ۔ چونکہ شرک ظُلمِ عظیم اور مُنکر ہے ، اس لیے مشرک شرک کرنے کے باوجود یہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ مُشرک ہے اور شرک کرتا ہے ۔ مشرکوں کے شرک کو شرک نہ سمجھنے کی ایک بنیادی وجہ سحرِ آذری ہے ۔ چنانچہ یہ آذر ہیں جو تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ابلیسی فنون کے ذریعے اپنے مریدوں ، عقیدت مندوں اور مقتدیوں کو یہ باور کرا دیتے ہیں کہ ان کے اولیاء اللہ یا برگزیدہ ہستیاں اُلوہیت و ربوبیّت کے مقام پر متمکن ہیں ، لہٰذا ان کی حمد و ثنا اور پرستش و بندگی کرنا ، ان کو پکارنا ، ان سے مرادیں اور مدد مانگنا ؛ نیز انہیں سمیع و بصیر ، حاضر و ناظر ، عالم الغیب والشّہادۃ ، کارساز و مشکل کُشا ، حافظ و ناصر ، داتا اور مستجیب الدّعوات سمجھنا جائز عبادت ہے ، شرک و گناہ نہیں ۔ آذر لوگوں میں مشرکانہ عقائد و رسومات اور بدعات اس لیے پھیلاتے ہیں تاکہ لوگ انھیں بھی اولیاء اللہ اور اپنا دینی پیشوا سمجھیں ، اور وہ مسندِ ارشاد پر متمکن ہو کر ان پر اپنا حکم چلائیں ، ان کا استحصال کریں ، ان سے نذرانے وصول کریں ، بیگاریں لیں اور ان کے پاس تعویذ وغیرہ کی شکل میں آیاتِ قرآنی فروخت کریں ؛ نیز جلبِ منفعت اور اپنی سیادت و سطوت قائم رکھنے کی خاطر موحّدین کے خلاف فتوے جاری کر سکیں ۔

قرآنِ حکیم اس حقیقت کا شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر نبیؑ و رسولؐ کا دین حقیقت میں اسلام تھا ، جس کی روح توحید تھی ، اور جملہ داعیانِ اسلام کی تحریکِ توحید کا نعرہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ تھا ۔ چونکہ یہ نعرۂ توحید معاشرتی سرطانوں یعنی وقت کے فرعونوں ، ہامانوں ، قارونوں اور آذروں کے لیے پیامِ مرگ تھا ، لہٰذا اس نعرے کے حریف ان کے دل ہو سکتے تھے نہ ہوئے ۔ چنانچہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ انہوں نے تحریکِ توحید کی پُرزور

مخالفت کی۔ چونکہ لَا ان کی کبریائی اور ان کے خودساختہ معبودوں اور ان کی خدائی کی نفی واستیصال کا اور اِلَّا فقط ایک اِلٰہ (= معبود و خدا) کی کبریائی وخدائی کے اثبات و اقرار کا نعرہ (SLOGAN) تھا، اور معاشرتی سرطان ان الفاظ کے مفہوم اور توحید پر ایمان لانے کے نتائج وعواقب سے آگاہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے ہر زمان ومکان میں دعوتِ توحید کو قبول کرنے سے انکار کیا اور داعیانِ توحید کی حتّی الامکان مخالفت کی، ان پر اور ان کے اہل وعیال پر مظالم توڑے، انہیں قید وبند کی سزا دی، شہید کیا یا ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ اس واقعیّت کی تصدیق دیگر کتبِ سماوی اور تاریخ سے بھی ہوتی ہے۔

جب بھی کسی بستی میں حق اپنے عقائدِ جلیلہ ومحرکہ کی قوّت سے باطل پر غالب آگیا اور توحید عامۃ الناس کا دین بن گیا تو معاشرتی سرطانوں کو بھی بادلِ نخواستہ ان کے دینِ توحید میں شامل ہونا پڑا، لیکن انہوں نے اپنی سیادت وسطوت قائم رکھنے اور لوگوں کا استحصال اور اکتناز و احتکار کرنے، نیز سودخوری وسودکاری کی خاطر آزری طبقوں کی معاونت حاصل کر لی اور اس طرح وہ دینِ توحید میں مشرکانہ عقائد کی آمیزش کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے نتیجے میں معاشرتی سرطانوں کو فرعونی وہامانی اور قارونی دآزری کرنے کا موقع مل گیا۔ لَا و اِلَّا کی جنگ جو دراصل حق وباطل یا توحید وشرک کی جنگ ہے، ظہورِ آدمؑ کے عہد سے جاری ہے اور جاری رہے گی، لیکن قرآنِ مجید کی رُو سے حق بہر حال حق ہے، اُسے قائم ودائم رہنا ہے اور باطل بہر حال باطل ہے اور اس کے ہیولے میں فنا کی صورت مضمر ہے، لہٰذا اُسے فنا ہونا ہے، اس طرح حق انجام کار دین کے ہر گوشے میں غالب آکر رہے گا (التوبۃ ۹: ۳۳؛ الفتح ۴۸: ۲۸)۔

توحید جہاں وحدتِ اُلوہیّت وربوبیّت کی علمبردار اور اس کا درس دیتی ہے، وہاں وحدتِ انسانی کو بھی تسلیم کرتی اور حقوقِ انسانی کی داعی ونقیب ہے۔ اس کی رُو سے سب افرادِ نسلِ انسانی اصلاً ونسلاً ایک ہیں، سبھی آدم کی اولاد اور نفسِ واحدہ کی طرح

ہیں، لہٰذا سب حقوقِ انسانی کے حقدار اور واجب التکریم ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے اور یقیناً ہے تو پھر سب بنی نوع انسان کو اخوت و مساوات، عزت و آبرو، خوشحالی و اطمینان، امن و سلامتی، حُسنِ آزادی اور عدل و احسان سے زندگی بسر کرنے اور انہیں اپنے ربّ العالمین کی نعمتوں سے مستفید ہونے کے مساوی مواقع ملنے چاہئیں۔ یہی وہ بات ہے جو منکرانِ توحید مثلاً وقت کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور آذروں پر شاق گزرتی ہے اور وہ کسی حال میں بھی اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دولت، سیادت، قوت اور حکومت میں جذبۂ کبریائی و خدائی پیدا کرنے کی تاثیر ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے توحید انسان میں غیر اللہ کی کبریائی و خدائی کے اِنکار و اِبطال کا اور فقط ایک اللہ تعالیٰ کی کبریائی و خدائی اور اُلوہیت و ربوبیت کے اِقرار و اِثبات کا داعیہ پیدا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں توحید انسان میں شعورِ عبدیت پیدا کرتی اور اس کے حقیقی اِلٰہ و ربّ کے حوالے سے اس میں جذبۂ عبودیت کا نشو و ارتقاء کرتی اور اس کے قلب میں محبتِ اِلٰہی کی شمع اس طرح فروزاں کرتی ہے کہ غیر اللہ کی محبت کی تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں۔

جو اہلِ ایمان اور اہلِ کتاب یہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں کہ فقط ایک اللہ تعالیٰ ہی ان کا اِلٰہ و ربّ ہے تو عقلِ سلیم کی رُو سے ان پر لازم آتا ہے کہ وہ اپنے جملہ خود ساختہ معبودوں کو تیاگ کر اور ان سے منہ موڑ کر خلوصِ دل کے ساتھ فقط ایک اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت و عبادت یعنی حمد و ثنا، رکوع و سجدہ اور پرستش و بندگی کریں۔ اسی کو قرآن مجید دینِ قیّم، دینِ حنیف اور دینِ اسلام سے؛ نیز اسی کو وہ اپنے انعام یافتہ و راست رو بندوں: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی صراطِ مستقیم سے تعبیر کرتا اور سب کو اس پر چلنے کی تاکید کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کُل انبیاء علیہم السلام نے لوگوں کو اس دینِ توحید کی دعوت دی تھی۔ اس دعوے کے ثبوت میں اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت نقل کی جاتی ہے، جو قرآنِ مجید نے اپنے اندر محفوظ کر لی ہے:

(حضرت یوسف علیہ السلام اہلِ زنداں سے خطاب فرماتے ہیں)" واقعہ یہ ہے کہ میں اس قوم کے مذہب سے منہ موڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کے دین کی پیروی کرتا ہوں۔ ہم (اولادِ ابراہیمؑ) ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائیں۔ درحقیقت یہ (دینِ توحید) ہم پر اور تمام انسانوں پر اللہ کا فضل ہے، مگر اکثر لوگ اس نعمت کا شکر نہیں کرتے۔

اے قید خانے کے رفیقو! (غور تو کرو!) طرح طرح کے داتا و آقا (= ارباب) بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ (سنو!) تم اس کے سوا جن ہستیوں کی عبادت کرتے ہو وہ محض نام ہی نام ہیں (یعنی اسمائے بے مسمّیات ہیں) جو تمہارے اباؤ اجداد نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نہیں اتاری۔ حکم (آئین و قانون دینے اور حکمرانی کرنے کا اختیار) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔ اس کا حکم ہے کہ اس کے سوا تم کسی اور کی عبادت (= بندگی) نہ کرو۔ یہی دینِ قیّم، یعنی سیدھا اور دائم (قائم رہنے والا) دین ہے، مگر اکثر لوگ (یہ حقیقت) نہیں جانتے (یوسف ۱۲: ۳۷ تا ۴۰)۔

میرے نزدیک یہ آیاتِ جلیلہ فلسفۂ توحید و شرک پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہیں اور اپنی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر تفصیل و تصریح کی متقاضی ہیں، لیکن یہ موقع و محل ایجاز و اختصار چاہتا ہے، لہٰذا چند حقائق کے استنباط پر اکتفا کیا جاتا ہے:

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ یعنی ایک الٰہ و ربّ پر کامل طور سے ایمان نہ لانے اور آخرت کا انکار کرنے والے مشرک و کافر ہوتے ہیں؛ لہٰذا انبیائے کرامؑ اور ان کے متبعین ان کے مذہب سے بیزار و متنفّر ہوتے ہیں۔

دوسرے، اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر انبیاء حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام سب موحّد تھے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں مانتے تھے۔ ان آیات میں یہ نکتہ بھی مضمر ہے کہ جملہ انبیاء علیہم السلام کا مسلک توحید تھا اور ان کی

تحریکِ توحید کا مقصد شرک کا استیصال کرنا تھا۔

تیسرے، بنی نوعِ انسان پر یہ اللہ تعالیٰ کا فضلِ عظیم ہے کہ اس نے انھیں دینِ توحید عطا کیا ہے، لیکن ظالم و جاہل ہیں وہ لوگ جو اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر نہیں کرتے اور نہ شکر ہی کرتے ہیں، بلکہ شرک کرتے ہیں اور مشرکوں کی اکثریت بھی ہے۔

چوتھے، موحّد فقط ربّ العالمین کا بندہ و عابد ہوتا ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے، جبکہ مشرک متفرّق ارباب یا خداؤں کا بندہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مشرکوں کو اس حقیقت پر غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ ایک خدا کے بندے بن جائیں، اس لیے کہ ربِّ ذوالجلال والاکرام کا بندہ ہونا تو انسان کے لیے موجبِ شرف و افتخار، باعثِ عزّت و طمانیت اور وجہِ فلاح و کامیابی ہے۔ بخلاف اس کے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہستیوں کو، جو اس کی محتاج ہیں، اپنا ربّ و معبود بنانا اور ان کی بندگی کرنا، انسانیت کی توہین، خودی کی تذلیل اور تشخّصِ ذات کی نفی ہے۔

پانچویں، اللہ تعالیٰ کے سوا جن ہستیوں کی مشرکین عبادت کرتے ہیں، وہ دراصل محض ان کے ناموں کی عبادت کرتے ہیں، جن سے وہ خود انھیں موسوم کرتے ہیں، اس لیے کہ ان میں وہ معانی یا صفات نہیں پائے جاتے جو ان ناموں کے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ جن ہستیوں کو خدا کا اوتار، خدا کا بیٹا، رازق، داتا، حاجت روا، مشکل کشا، کارساز، حافظ و ناصر، حاضر و ناظر، سمیع و بصیر، عالم الغیب، مستجیب الدّعوات وغیرہ وغیرہ مانتے ہیں، ان میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔ یہ نام دراصل اسمائے بے مسمّیات ہیں، یعنی ان ہستیوں کی نسبت سے بے معنی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بندہ نہ تو صفاتِ الٰہیہ کا مالک اور نہ اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر مخلوق بلا استثنیٰ حادث اور اللہ تعالیٰ کی محتاج ہوتی ہے، جیسا کہ قرآنِ مجید سے ثابت ہے:

"اے بنی نوع انسان! تم اللہ کے محتاج و نیازمند ہو اور اللہ بے نیاز و بے احتیاج اور ستودہ صفات ہے (فاطر ۳۵ : ۱۵)؛

لیکن یہ آذروں کے تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کا کرشمہ ہے کہ لوگ مخلوق و حادث ہستیوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں شریک مانتے اور ان کی اسی طرح حمد و ثنا اور پرستش و بندگی کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کی کرتے ہیں، یا کرنی چاہیئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شرک و بت پرستی کی ایجاد و ترویج تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے آذری فنون کی مرہونِ منت ہے تو مبالغہ نہیں، حقیقت کا اعتراف ہوگا۔

چھٹے، اللہ تعالیٰ ربّ النّاس، ملک النّاس اور اِلٰہُ النّاس ہے، لہٰذا افرادِ نسلِ انسانی پر حکم چلانے اور حکمرانی کرنے کا فقط وہی سزاوار و حقدار ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ اس کے سوا کوئی بندہ بھی اس کے بندوں پر اپنا حکم چلانے اور حکمرانی کرنے کا مجاز ہے نہ سزاوار۔ جو شخص ایسا کرتا ہے، وہ دراصل اپنے آپ کو خدا سمجھتا اور "خدائی" کرنا چاہتا ہے۔ ایسے ہی مدّعیِ خدائی کو "فرعون" کہتے ہیں۔ جو لوگ کسی ہستی کو چاہے زندہ ہو یا مردہ، حکم دینے کا مجاز و سزاوار سمجھتے ہیں، وہ شرک کرتے ہیں جو ظلمِ عظیم اور ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ ہے۔

ساتویں، شرک کی بنیاد ظلم و جہل اور کذب پر ہوتی ہے اور اس کے جواز کی مشرکوں کے پاس کوئی خدائی سند نہیں ہوتی، لیکن ابلیس اور آذری شیطانوں کی جالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی کے سبب لوگ شرک کو عبادت سمجھ کر کرتے اور آذر اپنا کاروبارِ پیری و مجاوری چلاتے ہیں۔ فلسفۂ شرک کا لُبِ لباب یہ ہے کہ شرک بے حقیقت و باطل ہے اور لوگ سحرِ آذری سے مسحور ہو کر بے سوچے سمجھے اور جانے بوجھے آذروں کی باتوں پر ایمان لاتے اور ان کے احکام مانتے اور ان کی کورانہ تقلید میں شرک

اور اصنام پرستی (= اکابر پرستی، قبر پرستی، شبیہہ پرستی، مظاہر پرستی، مجسمہ پرستی، مورتی پوجا وغیرہ وغیرہ) عبادت و کارِ ثواب سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں فلسفۂ گناہ کا خلاصہ مجملاً بیان کیا جاتا ہے۔ جو لوگ گناہ کو گناہ سمجھ کر کرتے ہیں، ان کی زندگی میں جمالیاتی۔ نفسیاتی لمحے کی وقوع پذیری، تزکیۂ نفس اور آرزوئے حسنِ انقلاب و زندگی کے احیار کا امکان ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے یا اسے نیکی اور عبادت سمجھ کر کرتے ہیں، انہیں نہ توبہ کی توفیق ہوتی ہے اور نہ ان کی زندگی میں جمالیاتی۔ نفسیاتی انقلاب آنے کا امکان ہی باقی رہتا ہے۔

یہ تو تھا جملہ معترضہ۔ بات کورانہ تقلید کی ہو رہی تھی، جس سے ربِّ کریم نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"(اے انسان!) جس بات کا تجھے علم نہیں، اس کے پیچھے نہ لگ۔ (یاد رکھ!) کان، آنکھ اور قلب، یعنی حسّی، قلبی، نفسی قوتوں کا محاسبہ کیا جائے گا (الاسراء، ۱۷: ۳۶)۔

اس فرمانِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو کورانہ تقلید نہیں کرنی چاہیے، بلکہ حواس، عقل و فکر اور ضمیر و نفسِ لوّامہ سے کام لینا چاہیے۔

وجہ یہ ہے کہ تقلید و طیرۂ حیوانی ہے، جبکہ حواس و عقل سے کام لینا، شیوۂ انسانی ہے۔ قرآنِ مجید کی رُو سے حسّی، قلبی، نفسی قوتیں ہی تو شرفِ انسانی اور انسان و حیوان میں مابہ الامتیاز ہیں۔ چنانچہ جو لوگ اپنے ربِّ کریم کی اس نعمتِ عظمیٰ سے کام نہیں لیتے، جو لینا چاہیئے تو وہ اس کفرانِ نعمت کی پاداش میں ان کو اسفل سافلین کی حالت پر لوٹا دیتا ہے (التین ۹۵: ۵)۔

آٹھویں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو واضح الفاظ میں حکم دیا ہے جو حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ" اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ ساتھ ہی انسان کو اس حقیقت سے آگاہ بھی کر دیا کہ یہی دینِ قیّم ہے، یعنی جو سچا اور باقی رہنے

والا طریقۂ حیات ہے، لیکن انسانوں کی اکثریت اس سے آگاہ نہیں۔

حاصل کلام یہ کہ توحید ہی دینِ قیّم ہے اور یہی جملہ انبیاء کرام علیہم السلام کا دین تھا، اور اسی دین سے متعلق قرآنِ مجید کا دعویٰ ہے کہ وہ جملہ ادیان یا دین کے ہر گوشے پر غالب آ کر رہے گا، خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے (التوبۃ ۹: ۳۳)۔

(ب) دوسرا کلمۂ توحید یہ ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (الانعام ۶: ۵۷، یوسف ۱۲: ۴۰، ۶۷): یعنی حکومت صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے؛ اس کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی غیر اللہ چاہے وہ کوئی ہو، اللہ تعالیٰ کے بندوں پر اپنا حکم چلانے اور حکمرانی کرنے کا سزاوار و مجاز نہیں۔ قرآنِ مجید نے اپنے اس کلمے کی وضاحت ایجاز بلاغت سے اس طرح کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی لوگوں کا ربّ اور بادشاہ (ملک الناس) ہے (الناس ۱۱۴: ۱ تا ۲)؛ لہٰذا کوئی انسان مطلق العنان بادشاہ یا حکمران نہیں ہو سکتا؛ نیز وہ اپنی رعایا پر اپنا حکم نہیں چلا سکتا اور نہ ایسے قوانین ہی بنا اور نافذ کر سکتا ہے، جو احکام الٰہی کے متناقض یا ان کے مطابق نہ ہوں۔ حکمران اصل میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ یا نائب ہوتا ہے اور صرف اس کے احکام کے مطابق ہی حکومت کر سکتا ہے۔ چنانچہ جو حکمران اپنی مملکت میں احکامِ الٰہی یا آئینِ قرآن نافذ نہیں کرتا اور رعایا کو ان کے مطابق زندگی کرنے میں مجبور نہیں کرتا، نیز ملک کی عدلیہ احکامِ قرآن کے مطابق مقدمات کے فیصلے نہیں کرتی یا کرنے کی مجاز نہیں، وہ حکمران دراصل فرعون اور معاشرہ سرطانی ہوتا ہے۔ سرطانی معاشرے کی پہچان یہ ہے کہ وہاں فرعون کے ساتھ ہامانوں، قارونوں اور آزروں کی بھی عمل داری ہوتی ہے، جو رعایا کا استحصال کرتے، اُن کے انسانی حقوق سلب کرتے اور انہیں عدل و احسان سے محروم رکھتے ہیں؛ نیز وہاں شرک کی گرم بازاری ہوتی ہے اور لوگ اسے عبادت و کارِ ثواب سمجھ کر کرتے ہیں۔ آخر میں سورۂ مومن کی چند آیات پیش کی جاتی ہیں، جن میں شرک سے متعلق نہایت اہم و بصیرت افروز اشارے کیے گئے ہیں:

"(قیامت کے دن) اُن لوگوں نے جنھوں نے کفر یا توحید کا انکار کیا تھا، پکار کر کہا جائے گا: آج جتنا غصّہ تمہیں اپنے اوپر آرہا ہے، اس سے زیادہ غصّہ اللہ تعالیٰ کو تم پر اس وقت آتا تھا جب تمہیں ایمان (= توحید) کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے۔ وہ کہیں گے "اے ہمارے ربّ! تو نے فی الواقعہ ہمیں دو بار موت اور دو بار زندگی دے دی۔ اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ کیا اب یہاں (دوزخ) سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے؟" (جواب ملے گا) ۔ تمہاری یہ حالت اس وجہ سے ہے کہ جب اکیلے اللہ کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم ماننے سے انکار کر دیتے تھے، اور اگر اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کر لیا جاتا تو تم مان لیتے تھے۔ "حکم" اللہ عالی و اکبر کے لیے ہے۔ وہی ہے جو تمہیں نشان دکھاتا ہے اور آسمان سے تمہارے لیے رزق نازل کرتا ہے، مگر (ان نشانیوں سے) فقط وہی شخص نصیحت حاصل کرتا ہے جو اللہ کی طرف (بار بار) رجوع کرتا ہے۔ بس (فقط ایک) اللہ ہی کو پکارو، اس کے لیے دین کو (شرک سے) خالص کر کے، خواہ یہ بات کافروں کو سخت ناگوار ہی گزرے (المؤمن ۴۰ : ۱۰ تا ۱۴)۔

ان آیاتِ جلیلہ سے مندرجۂ ذیل حقائق مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ چونکہ مُشرک توحید کے مُنکر ہوتے ہیں، اس لیے حقیقت میں کافر ہوتے ہیں۔

۲۔ قیامت کے دن مُشرک دوزخ میں ہوں گے۔ وہ بہت زیادہ پچھتائیں گے اور انہیں اپنے آپ پر سخت غُصّہ آئے گا کہ انھوں نے شرک ایسا گھناؤنا اور ناقابلِ عفو گناہ کیوں کیا؟

۳۔ شرک ایسا گناہِ کبیرہ اور ظلمِ عظیم ہے کہ جب لوگ اس کا ارتکاب کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو سخت ناگوار گزرتا ہے اور وہ ان سے سخت بیزار اور غضبناک ہو جاتا ہے۔

۴۔ ایمان خالص توحید کا عقیدہ رکھنے اور اس پر قائم و دائم رہنے سے عبادت ہے۔

۵۔ اللہ تعالیٰ انسان کو صرف دوبارہ زندگی اور موت کی لذت سے آشنا کرتا ہے۔
اس سے تناسخ یا آواگون کے عقیدے کی تردید ہوتی ہے۔

۶۔ مشرک اگرچہ دنیا میں شرک کو شرک یا گناہ نہیں سمجھتے، بلکہ عبادت و کارِ ثواب خیال کر کے کرتے ہیں، دوزخ میں اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ شرک واقعی ظلم عظیم ہے، جس کا وہ ارتکاب کرتے رہے ہیں۔

۷۔ آخرت میں اعترافِ گناہ بے سود ہے۔

۸۔ توحید کا انکار کرنے اور شرک کا عقیدہ رکھنے اور کرنے والے دوزخ میں جائیں گے۔

۹۔ نہ صرف دنیا بلکہ آخرت میں بھی صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ ہی جو بے حد بلند مرتبت و بزرگ و برتر ہے، حکم چلانے اور حکمرانی کرنے کا سزاوار ہے۔

۱۰۔ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے وہی انسان نصیحت و عبرت حاصل کرتے ہیں جو اس کی طرف بار بار رجوع کرنے والے ہیں۔

۱۱۔ جہنم کے عذاب النّار سے بچنے اور جنّت میں جانے کا آسان نسخہ یہ ہے کہ انسان توحید پر ایمان لائے اور اس پر قائم و دائم رہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک توحید یہ ہے کہ انسان اپنے دین یعنی اپنے عقائد و اعمال کو شرک کی آلودگیوں سے پاک و صاف کر کے صرف اور تنہا اللہ تعالیٰ کو پکارے؛ اسی کی عبادت کرے، اسی کا حکم مانے اور اسی سے مدد مانگے۔ مختصر یہ کہ صرف اسی کو اپنا اِلٰہ و ربّ مانے اور اس عقیدۂ توحید کو اپنی زندگی میں خون کی طرح جذب کر لے، اس کے مطابق زندگی کرے اور اس پر قائم و دائم رہے۔ اس کے حسین نتائج کی طرف قرآنِ مجید نے مؤثر و بلیغ اشارے کیے ہیں؛ مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

"جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور پھر اس پر قائم و دائم رہے۔ یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں: "نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور

خوش ہو جاؤ اس جنّت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (فصلت ۴۱: ۳۰)۔
سورۂ احقاف میں ارشاد ہوتا ہے:

"بلاشبہ جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہی ہمارا ربّ ہے اور پھر اس پر قائم و دائم رہے تو ان پر خوف طاری ہوگا اور نہ وہ غم ہی کھائیں گے۔ یہی لوگ اہلِ جنّت ہیں اور اس میں ہمیشہ رہیں گے، اپنے ان اعمال کے بدلے میں جو وہ دُنیا میں کرتے تھے (۴۶: ۱۳ تا ۱۴)۔

توحید ربوبیّت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کُل جہانوں کا اِلٰہ و ربّ ہے، اُس نے آسمانوں اور زمین اپنی بیشمار و بے قیاس نعمتیں کُل بنی نوع انسان کے "تمتّع" کے لیے پیدا کی ہیں۔ قرآن مجید یہ لفظ اصطلاح کے طور پر اس معنی میں استعمال کرتا ہے کہ انسان اس کی نعمتوں سے اپنے حسنِ ضرورت یا جائز ضروریات کو پورا کرنے کے لیے معاشرتی معیار کے مطابق استفادہ تو کر سکتا ہے اور اسے کرنا بھی چاہیئے، لیکن انہیں ہلاک و برباد یا محبوس کرنے کا مجاز نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں اور وہی ان کا مالک بھی ہے، لہٰذا کوئی جماعت، فرد یا قوم ان نعمتوں کی مالک نہیں، بلکہ امینِ مستفاد ہے اور امانت میں خیانت نہیں کر سکتی۔ بالفاظِ دیگر، کوئی شخص مال و دولت کو نہ تو اسراف و تبذیر کے ذریعے تباہ و برباد کر سکتا اور نہ اکتناز و احتکار اور سود کاری کے ذریعے اسے محجوب و بیکار بنا سکتا ہے، نیز نہ وہ گردشِ دولت کے دائرے کو دولت مندوں کے درمیان محدود ہی کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے مُسرف و مبذّر خانہ براندازِ چمن، اکتناز و احتکار کرنے والے بخیل اور سود کاری کرنے والے مفسد و خون آشام ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نظر میں یہ سب لوگ مجرم و گناہگار، مغضوب و گمراہ اور اہلِ نار ہیں۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شرک انسان کو سُمندر سرشت و اہلِ نار اور توحید نفسِ مطمئنّہ اور صاحبِ حسن و سُرور بناتی ہے۔

قرآنِ مجید اور تاریخ شاہد ہیں کہ جو اہل ایمان عقیدۂ ربوبیت کو اپنی زندگی کا جزوِ لاینفک بنا لیتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم انفاق بالعفو پہ بطریقِ احسن عمل کرتے ہیں۔ صاحبِ نصاب ہوں تو زکوٰۃ دیتے اور ضرورت سے زائد مال و دولت (= العفو) کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، تنگدست ہوں تو تب بھی حسبِ توفیق فی السبیل اللہ خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ علاوہ بریں، وہ اپنے معاشرے میں کفالتِ قومی کا نظام قائم کرتے ہیں؛ اگر ایسا نظام قائم نہ ہو تو وہ افرادِ معاشرہ آپس میں ایک دوسرے کو ایسا کرنے کی تبلیغ و نصیحت کرتے ہیں تاکہ ربّ العالمین کے عیال و بندے اس کی نعمتوں سے استفادہ کر سکیں اور محروم نہ رہیں۔ الغرض، اخوّت و مساوات، عدل و احسان، حسنِ اکتساب و کفالتِ قومی ایسے معاشرے کی امتیازی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہاں نہ تو معاشرتی سرطان ہوتے ہیں اور نہ اس کے معاشی نظام کی اساس سود و استحصال پر استوار ہی ہوتی ہے؛ نیز نہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے محتاج و دست نگر ہی ہوتے ہیں۔

یہ ہے اسلامی معاشرہ، جسے "مثالی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں لوگ معاشرتی سرطانوں کے ظلم و استحصال، فتنہ و فساد، تضاد و تخالف، معاشی ناہمواری و بد دیانتی، معاشی خوف و حزن اور احساسِ تنہائی اور دیگر معاشرتی برائیوں (مثلاً سود و سودی سرمایہ کاری، رشوت و انتقادی بدکرداری، فحشا و منکرات، اسراف و تبذیر، احتکار و اکتناز، بخل و تکاثر، جلبِ منفعت و بیگار، چوری، رہزنی، نوسر بازی، نذرانہ گیری، مفت خوری وغیرہ وغیرہ) سے مامون و مصئون، امن و سلامتی سے خوشحال زندگی گزارتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ ایسے صالح و موحّد لوگوں کو ربّ ذوالجلال والاکرام دُنیوی و اُخری حسنہ عطا کرتا اور عذابِ النار سے محفوظ رکھتا ہے، اور قرآنِ مجید کے نزدیک یہ عظیم کامیابی ہے۔

فصل - ۸

فلسفۂ توحید و شرک، احادیثِ طیّبہ کی روشنی میں

دین کُل زندگی کو محیط ہے اور قرآنِ حکیم ان کے مسائل پر حرفِ آخر اور قولِ فیصل ہے اور اس حقیقت کو قولاً و فعلاً تسلیم کرنا مسلمانوں پر بالخصوص اور غیر مسلموں پر بالعموم فرض ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا، جو ربّ العالمین اور عالم الغیب والشہادۃ ہے، زندہ اور سچّا کلامِ آخر ہے۔ یہ مقدّس و طیّب کلام الٰہی پیغمبرِ اعظم و آخر حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر بذریعہ وحی نازل ہوا تھا۔ اس کے تحفّظ و مصئونیت کا ضامن خود ربّ عزیز و قدیر ہے۔ چونکہ آپؐ آخری نبی و رسول تھے اور ہمیشہ کے لیے جملہ افرادِ نسلِ انسانی کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور قرآنِ مجید کی تعلیمات و احکام کو ان تک پہنچانا اور ان کے مطالب و معانی اور مقصدیت و غایت سے انھیں آگاہ کرنا آپؐ کا اوّلین فرضِ منصبی تھا، لہٰذا آپؐ نے فلسفۂ توحید و شرک سے متعلّق جو فرمایا اور جسے امام بخاریؒ نے صبر آزما مساعیِ جمیلہ کے بعد جمع کر کے اپنی شہرۂ آفاق تالیف "صحیح بخاری" میں محفوظ کر لیا، اس کی تیسری جلد میں سے چند احادیثِ طیّبہ مزید تقویتِ ایمان کے لیے نقل کی جاتی ہیں:

۱۔ قتیبہ بن سعیدؓ، جریر، اعمش، ابراہیم، علقمہ، عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ "اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ"، یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے خراب و تاریک

نہیں کیا ....." تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ پر شاق گزرا، اور انھوں نے عرض کیا: "ہم سے کون ہے جس نے ایمان کو ظلم سے خراب و تاریک نہ کیا ہو؟" اس پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کیا تم نے (حضرت) لقمانؑ کا قول نہیں سنا: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ٥ (جلد ۳، ح ۱۸۱۰)۔

۲۔ مسدّد، بشر بن مفضّل، جُریری (دوسری سند) قیس بن حفص، اسمٰعیل بن ابراہیم، سعید جُریری، عبدالرحمٰن بن ابی بکرہؓ اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک بنایا جائے؛ نیز والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا، جھوٹی گواہی دینا، جھوٹی گواہی دینا ....." (۳: ۱۸۱۱)۔

۳۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں ایک اعرابی حاضر ہوا اور پوچھا: "یا رسول اللہ! کبائر یعنی کبیرہ گناہ کون سے ہیں؟" آپؐ نے فرمایا: "کسی کو اللہ کا شریک بنانا ....." (۳: ۱۸۱۲)۔

۴۔ شرک کی ضد و نقیض توحید ہے۔ جو شخص کلمۂ توحید خلوصِ دل سے رضوانِ الٰہی حاصل کرنے کی خاطر قولاً و فعلاً تسلیم کرتا ہے، وہ عذاب النّار سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کی ایک حدیثِ طیّبہ کا ملخّص پیش کیا جاتا ہے:
رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ جو شخص لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کہتا ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس پر آگ حرام کر دے گا (۳: ۱۸۲۸)۔

۵۔ قُتیبہ بن سعید، جَریر، منصور، ابو وائل، عمرو بن شُرَحبیل، (حضرت) عبداللہ سے

روایت کرتے ہیں ۔انھوں نے بیان کیا کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا وہ یہ ہے کہ تو اللہ کا شریک بنائے ، حالانکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے .....'' (۳ : ۲۳۶۷)۔

۶۔ اسلام میں توحید کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایمان جو اصلِ مسلمانی ہے ؛ یعنی ایمان لائے بغیر کوئی شخص مومن و مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اس کا مطلب توحید کا اِثبات و اقرار ہے ۔ دوسرے لفظوں میں کلمۂ توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی قول و عمل سے شہادت دینا ہے ۔حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ عبد القیس کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ ہمارے اور آپؐ کے درمیان مُضر کے مشرکین حائل ہیں، اس وجہ سے ہم آپؐ کے پاس حرمت کے مہینوں ہی میں حاضر ہو سکتے ہیں ۔آپؐ ہمیں ایسے جامع احکام بتلا دیجئے کہ اگر ان پر عمل کریں تو جنت میں داخل ہو جائیں اور اس کی طرف ان لوگوں کو بھی دعوت دیں جو ہمارے پیچھے رہ گئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا : میں تمہیں چار باتوں کا حکم دیتا ہوں اور چار باتوں سے منع کرتا ہوں ۔ میں تم کو اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ اللہ پر ایمان لانا کیا ہے ؟ اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں .....(۳ : ۲۴۰۱)۔

۷۔ لَا تُشْرِكْ بِاللهِ شَيْئًا وَّاِنْ قُتِلْتَ اَوْ حُرِّقْتَ (المشکوٰۃ) : نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں : کسی کو اللہ کے ساتھ شریک نہ کرو، اگرچہ کوئی تجھے قتل کر ڈالے یا جلا ڈالے ۔

اسلام میں شرک یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں کسی اور کو شریک سمجھنا اور

اسے خدا کی طرح امداد و حاجات کے لیے پکارنا یا اسے کارساز و مددگار، حیّ و قیّوم، سمیع و بصیر، عالم الغیب والشہادۃ اور مجیب الدّعوات سمجھنا، اتنا بڑا گناہ اور ظلمِ عظیم ہے کہ اسے کسی حال میں بھی کرنے کی اجازت نہیں، چاہے گردن قلم کرانی یا آگ میں جل کر جان دینی پڑے۔

۸۔ کسی شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! کون سا گناہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا: (سب سے بڑا گناہ) یہ ہے کہ تُو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو پکارے، حالانکہ اللہ نے تجھے پیدا کیا ہے (المشکوٰۃ)۔

اس حدیثِ طیّبہ میں یہ فکر انگیز نکتہ مضمر ہے کہ خالق کو اپنی تخلیق سے جتنی محبّت و شفقت ہوتی ہے، اتنی محبّت اس سے کسی اور کو نہیں ہو سکتی؛ مثلاً ماں کو اپنی اولاد سے یا کسی ادیب و فنکار کو اپنی تخلیقات سے جس قدر محبّت ہوتی ہے، اس قدر محبّت دوسروں کو ان سے نہیں ہو سکتی؛ لہٰذا اللہ تعالیٰ، جو انسان کا خالق ہی نہیں ربّ بھی ہے، اسے چھوڑ کر کسی دوسری ہستی کو امداد وغیرہ کے لیے پکارنا، ظلم و جہل نہیں تو اور کیا ہے؟

۹۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ بندہ اپنی جملہ حاجتیں اپنے ربّ ہی سے مانگے، حتّٰی کہ نمک بھی اُسی سے مانگے؛ اور اگر جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اپنے ربّ ہی سے مانگے (المشکوٰۃ)۔

۱۰۔ اس سے ملتی جلتی ایک حدیثِ طیّبہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: جب تو مانگے تو اللہ ہی سے مانگنا اور جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے مدد چاہنا (المشکوٰۃ)۔

۱۱۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ میری اُمّت میں سے کئی قومیں (شرک میں) مشرکین سے مل

جائیں گی، حتیٰ کہ وہ اوثان پوجنے لگ جائیں گی (المشکوٰۃ)۔ اس حدیثِ طیّبہ میں اوثان کی پوجا کی صراحت کر دی جاتی ہے۔ اوثان وثن کی جمع ہے اور اہلِ عرب اسے ہر اس چیز کے لیے استعمال کرتے ہیں، جس کی پرستش کی جائے" مثلاً بُت، مورتی، آستانہ، مقبرہ، شجر و حجر، شبیہہ، عَلم، تعزیہ، مکان، مقام وغیرہ وغیرہ۔

فصل-۹

توحید کی ابدی و عالمگیر حیثیت

توحید کی ابدی و عالمگیر حیثیت اور غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہر بستی میں اپنا رسول بھیجا اور ہر رسول کو بذریعہ وحی اس حقیقت سے آگاہ کرتا تھا کہ اس کے سوا کوئی معبود یا خدا نہیں، لہٰذا صرف اور فقط اسی کی حمد و ثنا اور پرستش و بندگی کرو۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: "(اے نبیِ اکرمؐ!) ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا جسے یہ وحی نہ کرتے ہوں کہ بلا شبہ میرے سوا کوئی معبود یا خدا (= اِلٰہ) نہیں، لہٰذا تم لوگ میری ہی عبادت کرو (الانبیاء ۲۱: ۲۵)۔ یہ حکمِ الٰہی سیدالمرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی بار دیا گیا تھا اور اس سے مقصود ہمیں شرک سے باز رکھنا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو حکم دیتا ہے کہ آپؐ لوگوں سے برملا کہہ دیں کہ "مجھے تو صرف اللہ کی حمد و ثنا اور پرستش و بندگی (= عبادت) کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ شریک ٹھیراؤں، لہٰذا میں اسی کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے (الرعد ۱۳: ۳۶)۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی عبادت اس کے لیے دین کو (شرک و بت پرستی سے) پاک کر کے کروں" (الزمر ۳۹: ۱۱)؛ نیز "میں اللہ کی عبادت اس کے لیے اپنے دین کو (شرک و بت پرستی سے) پاک و صاف کر کے کرتا ہوں (الزمر ۳۹: ۱۴)۔

ربّ العزّت نے ساتھ ہی پیغمبرِ اعظم و آخر صلّی اللہ علیہ وسلّم کو، دراصل ہمیں شرک سے باز رکھنے اور متنبّہ کرنے کی خاطر یہ ارشاد فرمایا کہ "اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تم تمہارے پاس آ چکا ہے، لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمہارا حامی و مددگار ہے اور اس کی پکڑ سے تمہیں کوئی بچا ہی سکتا ہے (الرّعد ۱۳: ۳۷)۔ اس آیتِ جلیلہ میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ توحید کی اساس علم پر ہے۔ اس کا نقیض یہ ہوا کہ شرک کی بنیاد جہل پر ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ مشرکوں اور بت پرستوں کو چیلنج دیتا ہے کہ اگر ان کے پاس شرک و بت پرستی کے جواز میں کوئی محکم دلیل ہے تو لائیں، اس قرآنِ حکیم میں سے یا اس سے پہلی کتبِ سماوی میں سے۔ پھر خود ہی فرماتا ہے کہ ان میں سے اکثر تو جانتے ہی نہیں کہ حق کیا ہے؟ ظاہر ہے وہ دلیل کہاں سے لائیں گے اور یہی ان کے حق سے اعراض کی وجہ حقیقی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوتا ہے:

"کیا اس (= اللہ تعالیٰ) کو چھوڑ کر انھوں نے دوسرے معبود و خدا بنا لیے ہیں؟ اے میرے پیغمبرؐ! ان سے کہو: لاؤ اپنی کوئی دلیلِ محکم! یہ کلام (= قرآنِ حکیم) بھی موجود ہے، جو میرے ساتھیوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ کلام بھی جو مجھ سے پہلوں پر نازل ہو چکا ہے (یعنی کتبِ سماوی) تم ان میں سے کوئی دلیل بھی اپنے موقف کے ثبوت میں نکال کر دکھاؤ)۔ اصل یہ ہے کہ ان میں سے اکثروں کو حقیقت کا علم ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حق سے منہ موڑے ہوئے ہیں" (الانبیاء ۲۱: ۲۴)۔

انسان اصلاً نفسِ واحدہ ہے، کیونکہ ربّ کریم نے اس کی تخلیق کے سلسلے کا آغاز نفسِ واحدہ سے کیا ہے (الاعراف ۷: ۱۸۹)؛ نیز اس نے جملہ بنی نوعِ انسان کی فطرت بھی اپنی فطرت پر بنائی ہے جو غیر مبدّل ہے (الرّوم ۳۰: ۳۰)، یعنی اس میں وحدت پائی جاتی ہے۔ چونکہ کُل بنی نوعِ انسان کی فطرت ایک ہی ہے، لہٰذا ان کے

فطری تقاضے بھی ایک جیسے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فاطرِ ہستی نے ایک طرف انسان کو اپنے ان فطری تقاضوں کی تشفی کرنے کے لیے ایک جیسے حواسِ خمسہ (خصوصاً سامعہ و باصرہ) اور قلب (دل و دماغ) ودیعت کیے ہیں، اور دوسری طرف اسے ہر زمان و مکان میں ایک جیسا دستور العمل عطا کیا ہے، جس کے لیے قرآنِ مجید نے وحی و تنزیلِ الہدیٰ، الکتاب، الدّین الیسی تعبیرات اِختیار کی ہیں۔

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ انسان طبعاً اور حاجتہً معاشرتی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، اس لیے اُسے "معاشرتی بشر" کہہ سکتے ہیں۔ نفسِ مضمون کو جامع طور سے سمجھنے کی خاطر اس امر کی صراحت کر دی جاتی ہے کہ حیاتِ انسانی کی دو حیثیتیں یا پہلو ہیں: انفرادی اور معاشرتی۔ یہ دونوں زندگی کے اجزائے لاینفک ہیں۔ انسان معاشرے کا فرد ہے۔ اسے ایک تو اپنے اندر کی دُنیا میں رہنا ہوتا ہے، اور دوسرے اسے باہر کی دنیا یا معاشرے میں زندگی بسر کرنا ہوتی ہے۔ اس کے اندر کی دُنیا اس کے افکار و تصوّرات، نظریات و معتقدات، جذبات و احساسات اور خواہشات و تمنّیات کی دُنیا ہوتی ہے۔ اگر انسان نے اپنی باطنی دُنیا کو حسین بنایا ہو تو اس میں معاشرتی زندگی کو حسین بنانے کی بھی طلب و جستجو ہوتی ہے۔ باطنی زندگی میں حسنِ یقین و عمل یا اصطلاحِ قرآنی میں اِیمان و عملِ صالح سے حسن پیدا ہوتا ہے۔ کثرتِ ذکرِ الٰہی سے قلب میں حُسن و نور اور اطمینان و سُرور پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ ایمان کی روح توحید ہے اور توحید کا مطلب ہے کہ صرف ایک اللہ کو اپنا اِلٰہ و ربّ سمجھنا اور فکری و عملی زندگی میں، دُکھ سُکھ اور شادی غمی میں اس عقیدے پر قائم و دائم رہنا۔

فکری زندگی انفرادی اور عملی زندگی اجتماعی ہوتی ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ مثال کے طور پر موحّد وہ شخص ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت پر یقین رکھتا

ہے وہ اپنی نفسانی خواہش کو اپنا اِلٰہ نہیں بناتا۔ خواہش سے مراد معروضِ خواہش (OBJECT OF DESIRE) ہے، مثلاً زر، زن، زمین، قوّت، حکومت، سیادت، شہرت، عزّت، قیادت، اقتدار، حاکمیت، شان و شوکت، اور لذّت و طرب، نشہ و مستی وغیرہ وغیرہ۔ صفتِ اُلُوہیت کی طرح موحِّد صفتِ ربوبیّت پر بھی یقینِ کامل رکھتا ہے، اور وہ غیراللہ کو اپنا رازق و پروردگار، داتا، دستگیر، کارسانہ، مُشکل کُشا، حاجت روا اور مستجیب الدّعوات نہیں سمجھتا، اور نہ اس کی پرستش و بندگی کرتا ہے اور نہ اس کو پکارتا اور اس سے مرادیں مانگتا ہے۔ غیراللہ کا مطلب ہر وہ زندہ و مردہ ہستی یا چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے یا انسان کی اپنی فنی تخلیق، مثلاً قبر، روضہ، مجسّمہ، شبیہہ، مورتی، آستانہ، یادگار وغیرہ وغیرہ۔

عمل کا مطلب فرد کا معاشرے میں زندگی کرنا ہے اور وہ عموماً اپنی سمجھ اور عقیدے کے مطابق زندگی کرتا ہے۔ چنانچہ اگر اس کی عقل سلیم اور عقیدہ حسین ہے تو وہ اپنے ربّ العالمین کی خوشنودی کے لیے اس کی حسین مخلوق بنی نوعِ انسان سے عدل و احسان کرتا ہے، کسی کا استحصال نہیں کرتا، کسی سے ناانصافی نہیں کرتا، کسی کو اس کے حقوق سے محروم نہیں کرتا اور نہ کسی پر ظلم ہی کرتا ہے؛ الغرض، وہ فساد نہیں اصلاح کرتا ہے اور معاشرے کو اخوّت و مساوات اور امن و سلامتی کی جنّت بنانے کی فکر و سعی کرتا ہے۔ ایسے عمل کو حسین یا صالح کہیں گے۔ چونکہ عمل کا طریق اور جہت ہوتی ہے، اس لیے حسنِ عمل کے لیے قرآنِ مجید عموماً "صراط المستقیم" کی تعبیر اختیار کرتا ہے۔ چونکہ اہلِ ایمان کے حُسنِ عمل میں رضائے اِلٰہی اور اپنی حسنہ و زندگی کی آرزو مضمر ہوتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْماً (= میری راہِ راست) اور سَوَآءَ السَّبِیْلِ (= حسین راستہ) سے بھی تعبیر کیا ہے (دیکھیے بالترتیب الانعام ۶: ۱۵۳؛ اور البقرۃ ۲: ۱۰۸)۔ ساتھ ہی یہ فکر انگیز و بصیرت افروز حکم دے کر کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے

کے راستے کی پیروی کرو اور متفرق راستوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ اس۔کے راستے سے ہٹا دیں گے (۶ : ۱۵۳)، یہ حقیقت منکشف کردی کہ اس کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ توحید ہے اور اس کے سوا باقی تمام راستے شرک کے ہیں۔ چونکہ شرک میں کثرت ہوتی ہے، اس لیے اس کے راستے مختلف اور علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں؛ نیز یہ ارشاد بھی فرمایا کہ اللہ تمہیں اس لیے ایسا کرنے کی وصیت کرتا ہے تاکہ تم میں تقویٰ یعنی اس راہِ حسن وحق کی طلب و جستجو پیدا ہو" (موضوعِ مذکور)۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ توحید سے تقویٰ یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ کی طلب و جستجو اور گمراہی کا خوف پیدا ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ توحید ہی اصلِ دین ہے اور کُل انبیاء علیہم السلام، جو صراطِ مستقیم پر تھے، اسی ایک دین کی دعوت دینے مبعوث ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سب اقوامِ عالم بلکہ جملہ افرادِ نسلِ انسانی کا دین ایک ہی تھا اور وہ دینِ توحید تھا، جس کی خالص و حسین اور کامل صورت کا نام "اسلام" ہے، اس لیے ربّ العالمین نے اسے تمام بنی نوعِ انسان کے لیے پسند فرمایا ہے اور اسی کو حقیقی دین قرار دیا ہے (دیکھیے المائدہ ۵ : ۳؛ آلِ عمران ۳ : ۱۹)۔ ادیانِ عالم کی کتبِ سماوی اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ کُل اہلِ کتاب کا دینِ حقیقی، دینِ توحید تھا اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ہر دین و مذہب کے پیرو شرک و بت پرستی کرنے کے باوجود توحید کے قائل اور شرک کے منکر ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ کُل ادیانِ عالم میں توحید قدرِ مشترک ہے اور یہ عالمگیر اتحاد یا اتحاد بین الاقوام کی اساس بن سکتی ہے۔ یہی تحریکِ اسلام کا مقصود بھی ہے، اور قرآنِ مجید کی رُو سے یہ ہو کر رہے گا۔ اقوامِ عالم کو توحید پر عملاً ایمان لانا پڑے گا اور دین کے ہر گوشے پر توحید کا غلبہ ہوگا اور یہ شدنی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ توحید انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، جس کو پورا کیے بغیر وہ خوف و حزن کے عذاب النار سے نہ تو محفوظ رہ سکتا ہے اور نہ امن و سلامتی سے زندگی

ہی کرسکتا ہے۔ یہی حقیقت مندرجۂ ذیل آیۂ جلیلہ میں مضمر ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ... شَهِیْدًا (الفتح ۴۸: ۲۸):

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُسے دین کی کُلّیت (یعنی اس کے جملہ گوشوں) پر غالب کردے اور اس حقیقت پر اللہ شاہد کافی ہے۔ سورۃ الصّف میں ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا چاہے مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے (۶۱: ۹)۔

توحید کا شرک پر غلبہ پانا یا دین کے ہر مشرکانہ شعبے اور گوشے پر غلبہ پانا، اس لیے بھی شدنی اور فطری امر ہے کہ ہر زمان و مکان میں ہر نبیؑ کی اُمّت (= سچے پیروکار) موحّد تھی اور سب اُمّتوں کا ایک ہی دین تھا، گو بعد میں ان کے غیر مخلص پیروؤں نے نفسی۔ ابلیسی شیطان کی جمالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی کے سبب توحید کی راہِ راست چھوڑ دی اور شرک و کفر کی مختلف راہوں کو اختیار کرلیا۔ اس مسلّمہ کُلّیہ کے مطابق کہ کُلُّ شَیْءٍ یَرْجِعُ عَلٰی اَصْلِهٖ (= ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے)، کُل دینی فرقوں کا شرک و کفر کی مختلف دھبرا گا نہ راہوں کو چھوڑ کر توحید کی صراطِ مستقیم پر لوٹنا ناگزیر ہوا۔

ربّ العالمین نے اپنے آخری کلامِ حق میں بار بار اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے کہ اُس نے نبیِ اوّل حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبیِ آخرالزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم تک دنیا کے ہر خطّے اور بستی میں جو پیغمبرؑ بھی بھیجے ان سب کا ایک ہی دین تھا، اور ان کی دعوتِ حق بھی ایک ہی تھی اور وہ دعوتِ توحید تھی۔ اس کے نتیجے میں ان سب کی اُمّت (یعنی سچّے اور مخلص پیروکاروں کی جماعت) بھی ایک ہی تھی، اور رہے۔ پھر یہ ہوا کہ ہر اُمّت میں آزری شیطانوں نے اپنی سیادت و قیادت اور جلبِ منفعت و اقتدار کی خاطر اپنے جمالیاتی فریب کے ذریعے شرکِ باطل کو حسین بنا کر دکھایا اور اہلِ ایمان کو ایمان بالباطل کی دعوت دی اور وہ اس خوبصورت

دھوکے میں آ کر مارے گئے۔ چونکہ شرک کے ہیولے میں تشتّت و تحزّب کی صورتیں مضمر ہوتی ہیں، اس لیے وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے اور انہوں نے فکر و عمل کی مختلف و جداگانہ راہیں اختیار کرلیں۔ پھر شرک و کفر کی ہر راہ کو توحید کی راہِ مستقیم سمجھ کر اس پر گامزن ہو گئے اور بعد میں آنے والوں نے بھی ان کی پیروی کی اور اس پر اترانے لگے۔ اس ازبس اہم تاریخی واقعیت کو قرآنِ مجید نے اپنے ایجازِ بلاغت سے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے:

یٰاَیُّهَا الرُّسُلُ ..... عَلِیْمٌ ○ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً .....

فَرِحُوْنَ ○ (المؤمنون ۲۳: ۵۱-۵۳):

اے پیغمبر! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور صالح عمل کرو۔ تم جو بھی کرتے ہو، میں اسے خوب جانتا ہوں، اور یہ تمہاری اُمّت ایک ہی اُمّت ہے اور میں تمہارا ربّ ہوں (اور کوئی تمہارا رازق و پروردگار اور حاکم و آقا نہیں ہے)۔ پس میرا تقویٰ کرو (مجھ سے یعنی میرے قانونِ مکافاتِ عمل سے ڈرو، کسی اور کا خوف نہ کھاؤ، نیز میری طلب و جستجو کرو، کسی اور کی نہیں)۔

پھر ایسا ہوا کہ بعد میں لوگوں نے اپنے دین (کی وحدت کو ختم کر کے) ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ہر گروہ کے پلّے جو پڑ گیا، وہ اسی میں مگن ہے۔

یہ آیاتِ جلیلہ انتہائی اہم اور ایمان افروز ہیں۔ ان میں اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ دین میں عالمگیر وحدت پائی جاتی ہے، کیونکہ اس کی اصل توحید ہے؛ نیز جملہ انبیاء علیہم السلام نے صرف اسی دینِ توحید کی دعوت دی تھی، اور ان کے سچّے اور مخلص متّبعین ہی ان کی اُمّت ہیں، لہٰذا سب پیغمبروں کی اُمّتیں حقیقت میں ایک ہی اُمّت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جملہ موحّدین اُمّتِ واحدہ ہیں اور وہی دین کے مخلص اور سچّے پیروکار ہیں۔ علاوہ بریں، مشرکین کسی پیغمبر کی اُمّت

نہیں ہیں، بلکہ یہ فرقے اور گروہ (= حزب) ہیں۔ اس سے مستنبط ہوا کہ توحید اُمّتِ واحدہ کو اور شرک مختلف فرقوں کو چاہتا ہے ؛ نیز توحید سے اہلِ ایمان میں وحدت و صداقت اور شرک سے تفرقہ و باطل پیدا ہوتے ہیں۔ یہ آیاتِ جلیلہ ہمیں آئینہ دکھاتی ہیں کہ ہم اس میں دیکھیں کہ ہم موحّد و اُمّت ہیں یا مشرک و فرقے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ حُسن و حق دیکھنے کے لیے یا حسن و قُبح اور حق و باطل میں فرق معلوم کرنے کے لیے ہمیں حُسنِ نیّت کے ساتھ تعصّب و غرور کی عینک اُتار کر چشمِ بینا سے دیکھنا ہوگا۔

فصل - ۱۰

توحید اور نظامِ اسلام

دین ایک وحدانی کُل ہے اور کُل حیاتِ انسانی کو محیط ہے اور اس کی اصل توحید ہے۔ اس اعتبار سے زندگی کے ہر شعبے کی اساس بھی توحید ہے اور مجموعی لحاظ سے یہی نظامِ اسلام ہے کہ اسلامی اور غیر اسلامی نظاموں میں، توحید ہی مابہ الامتیاز ہے، لہٰذا اس کے حوالے سے ہم زندگی کے بڑے بڑے شعبوں پر فرداً فرداً بحث کرتے ہیں، اور شروعات معاشی نظام سے کرتے ہیں۔

عقیدۂ توحید کے کچھ اپنے تقاضے ہیں، جن کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو پورا کیے بغیر زندگی کے کسی شعبے کا نظام "اسلامی" نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اب ہم معاشی نظام میں توحید کے تقاضوں سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلام میں اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت و ربوبیت کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ عقیدۂ ربوبیت کا تعلق معاشی نظام سے ہے اور یہ اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر نہ تو زندگی کا کاروبار احسن طریق سے چل سکتا ہے اور نہ قومی دولت کی تقسیم منصفانہ ہی ہو سکتی ہے؛ نیز نہ بنی نوع انسان اپنے

ربِّ کریم کی نعمتوں میں سے اپنا حق ہی لے سکتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے، کیونکہ اسے جھٹلانے کی ہمارے پاس کوئی وجۂ جواز نہیں تو پھر توحید پر ایمان لانا، یعنی اس کے مندرجۂ ذیل تقاضوں کو پورا کرنا ناگزیر ہوا:

اوّل، اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک اور بنی نوعِ انسان سمیت کُل مخلوقات کا خالق و رازق، پروردگار و مالک ہے، اور وہ سب اس کے عیال ہیں۔ اس اعتبار سے سب افرادِ نسلِ انسانی واجب التکریم ہیں۔

دوم، اس نے آسمانوں اور زمین میں کُل نعمتیں جملہ افرادِ نسلِ انسانی کے تمتّع و استفادے کے لیے پیدا کی ہیں، لہٰذا وہ سب اس سے تمتّع کرنے کے حقدار ہیں۔

اس کا نقیض یہ ہوا کہ کوئی فرد، خاندان، جماعت، قبیلہ یا قوم دوسروں کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے متمتّع ہونے سے منع کرنے کی مجاز نہیں اور نہ انھیں ان کے حقِ معلوم سے محروم ہی رکھ سکتی ہے۔

سوم، توحید کی بدولت سارے اہلِ ایمان بھائی بھائی ہوتے ہیں (الحجرات ۴۹: ۱۰)، لہٰذا انہیں اپنے ربِّ کریم کی دنیا میں صالح بھائیوں کی طرح رہنا سہنا اور کھانا پینا چاہیئے۔

چہارم، چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو محنت، و مشقّت میں پیدا کیا ہے (البلد ۹۰: ۴)، یعنی محنت کر کے روزی کمانا اور کسبِ علم و ہنر کرنا، اس پر فرض ہے، اس لیے افرادِ نسلِ انسانی پر نفسِ واحدہ کی طرح دولت کی پیداوار و افزائش میں حصّہ لینا لازم ہے؛ نیز انھیں ان کی محنت و مشقّت کی کیفیت و کمیّت اور ضروریاتِ زندگی کے مطابق قومی پیداوار میں حصّہ ملنا چاہیئے۔ بالفاظِ دیگر، دولت کی تقسیم قرآن مجید کے اصولِ عدل و احسان کے مطابق ہونی چاہیئے۔

اسلام میں توحید کے تقاضوں کو پورا کرنا حکومت کی بنیادی ذمے داری ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت رعایا کی کفالتِ کُلّی، یعنی ان کی روزی و روزگار، پوشاک و مکان، تعلیم و تربیت، صحت و صفائی اور سیر و تفریح وغیرہ وغیرہ کا حتیّ المقدور احسن انتظام کرنے کی مکلّف ہے۔ بخلاف اس کے جو حکومت ایسا نہیں کرتی، وہ نہ تو توحید کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور نہ اس کے عقیدے کو عملاً تسلیم ہی کرتی ہے۔ ایسے ہی نام نہاد مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ مخاطب کر کے حکم دیتا ہے:

یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا..... (النسآء ۴: ۱۳۶) : اے لوگو! جو (زبان سے) ایمان لائے ہو۔ (عملاً بھی) ایمان لاؤ.....

چونکہ توحید پر ایمان لانے سے اخوّت و مساوات اور آزادی و تکریمِ انسانی اور عدل و احسان کے قرآنی اصولوں کو قولاً و فعلاً تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ لہٰذا اسلام اکتناز و احتکار، بُخل و تکاثُر، اسراف و تبذیر، ظلم و استحصال، سود و سودی سرمایہ کاری (مثلاً مزارعت و مضاربت، بینکاری و ساہوکاری، کرایہ گیری و دستارگیری، سٹے بازی، نیز بانڈ، ٹرسٹ، تمسکات، حصص وغیرہ وغیرہ کا کاروبار) کی اجازت نہیں دیتا، بلکہ ان کو گناہِ کبیرہ سمجھتا ہے اور ان سے سختی سے منع کرتا ہے۔ دوسرے وہ اقتصادی بددیانتی و بدکرداری (مثلاً کم تولنا، کم ماپنا، کم ناپنا، امانت میں خیانت کرنا، دھوکے سے ناقص مال فروخت کرنا، دکھانا کچھ دینا کچھ، جھوٹی قسمیں کھانا، عہد شکنی کرنا، چیزوں میں ملاوٹ کرنا، ذخیرہ اندوزی کرنا، چور بازاری اور سمگلنگ کرنا وغیرہ وغیرہ) کی ممانعت کرتا ہے، تیسرے وہ زکوٰۃ دینے اور انفاق بالعفو کا حکم دیتا ہے۔ انفاق بالعفو کا مطلب یہ ہے کہ حسبِ ضرورت سے زائد مال و دولت کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خود خرچ کرنا یا بیت المال میں جمع کرا دینا۔ چوتھے، وہ قومی دولت کی تقسیم میں عدل و احسان کے قانون کا اطلاق اس طرح کرنے کا حکم دیتا ہے کہ قوم کی معاشی زندگی رنگِ اخوّت و مساوات سے مزیّن رہے تاکہ قوم میں تنازعات و مناقشات اور تضادات و عصبیت کا امکان نہ رہے۔ علاوہ ازیں

معیارِ زندگی میں حسنِ تفاوت کے سبب معاشرے میں قارون و فرعون ایسے معاشرتی سرطان پیدا ہوں گے نہ انسان کی تذلیل و تحقیر ہی ہوگی اور نہ آدمی آدمی کو اپنا محکوم و غلام ہی بنا سکے گا۔ ایسا معیارِ زندگی اپنے حُسن کے باعث تکریمِ انسانی اور انسانی حقوق کے تحفّظ کی ضمانت فراہم کر سکتا ہے، جیسے اس نے عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے دور میں کی تھی۔

حاصلِ کلام یہ کہ عقیدۂ توحید کی رُو سے جب سب افرادِ نسلِ انسانی نفسِ واحدہ کی طرح ہیں اور سب کا رازق و پروردگار اور آقا و مالک ایک اللہ تعالیٰ ہے، جو وحدہٗ لاشریک ہے، اور اس نے اپنی جملہ نعمتیں جملہ بنی نوعِ انسان کے لیے پیدا کی ہیں، جو اس کے عیال و پروردہ اور محتاج و گدا ہیں، تو پھر اس حقیقت کو تسلیم کرنے والوں یعنی موحّدین کے معاشرے میں کوئی انسان دوسرے انسان کا نہ تو محتاج و غلام اور نہ اپنے حقوقِ انسانی سے کلّی یا جزوی طور سے محروم ہی ہوگا۔ علاوہ بریں، ایسا معاشرہ اخوّت و مساوات اور محبّت و حریّت، عدل و احسان، خوشحالی و طمانیت، نور و سرور اور امن و سلامتی کی جنّت ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، وہ خوف و حزن، ظلم و استحصال، احتیاج و افلاس، محکومی و غلامی، ذلّت و مسکنت اور فتنہ و فساد سے پاک و منزّہ ہوگا۔ کیا ایسا معاشرہ مثالی نہیں؟ کیا بنی نوعِ انسان کو اس کی حاجت نہیں؟ اگر ان دونوں سوالوں کا جواب اِثبات میں ہے اور یقیناً ہے تو پھر دینِ توحید بنی نوعِ انسان کی ایسی ناگزیر ضرورت ہے جس کو پورا کرنے پر وہ انجام کار مجبور ہوں گے؛ اور یہی مطلب اس آیتِ جلیلہ کا ہے کہ دینِ توحید یقیناً دین کے ہر گوشے پر غالب آ کر رہے گا (الفتح ۴۸: ۲۸)۔

توحید اور سیاسی نظام:

توحید ایک حکمران کو چاہتی ہے وہ ہے اللہ تعالیٰ؛ جس کا ارشاد ہے کہ وہ رَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ إِلٰهِ النَّاسِ ۝ (النّاس ۱۱۴: ۱تا۳)؛ یعنی اللہ تعالیٰ بنی نوعِ انسان کا رازق و پروردگار اور آقا و مالک ہے۔ لوگوں کا بادشاہ ہے۔ لوگوں کا معبود و مقصود ہے۔

جب یہ حقیقت ہے تو پھر اس پر ایمان لانا موحدین پر فرض ہوا؛ نیز انہیں قولاً و فعلاً تسلیم کرنا ہوگا کہ فقط اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں پر حکمرانی کرنے اور انھیں احکام (= آئین و قوانین) دینے کا سزاوار ہے۔ چنانچہ توحید کا تقاضا یہ ہوا کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف ۱۲: ۴۰)؛ یعنی (اس کے بندوں پر) اللہ تعالیٰ کے حکم کے سوا کسی اور کا حکم نہیں چل سکتا۔

توحید کے اس بنیادی سیاسی تقاضے کو ہم توحید کے عملی۔سیاسی پہلو سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

ظاہر ہے جو قوم موحّد ہوگی، اس کے سیاسی نظام کی اساس بھی توحید پر اُستوار ہوگی۔ اس کے نتیجے میں ایک تو اس قوم کا آئین، آئینِ الٰہی ہوگا، لہٰذا اس کا حکمران اللہ تعالیٰ کا نائب ہوگا اور اس کے احکام کے مطابق حکومت کرے گا؛ دوسرے، وہ مستبد و مطلق العنان نہیں ہوگا اور نہ وہ رعایا پر کسی نام سے بھی اپنا یا اپنی جماعت کا حکم چلانے اور نہ اُسے اپنا آئین دینے کا مجاز ہی ہوگا۔ تیسرے، وہ ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نعمتوں کو اس کے بندوں میں جو اس کی رعایا ہوں گے، عدل و احسان کے اصولوں کے مطابق تقسیم کرنے کا مکلف ہوگا۔ اس مقصد کی خاطر اس کے لیے کفالتِ قومی کا نظام قائم کرنا اور اسے احسن طریق سے چلانا، ناگزیر ہوگا، چوتھے، ایسے سیاسی

نظام میں فرعون وہامان اور قارون و آزر ایسے معاشرتی سرطانوں کے پیدا ہونے کا کوئی امکان نہ ہوگا۔ اس کے نتیجے میں کوئی انسان کسی انسان کا محکوم و غلام ہوگا نہ محتاج و دست نگر، اور نہ کوئی اپنے انسانی حقوق سے محروم ہی ہوگا۔ اس کے برعکس سب لوگ آزادی و مساوات، عدل و احسان اور اپنے انسانی حقوق سے بہرہ مند ہوں گے۔ پانچویں، اللہ تعالیٰ کے احکام (= آئین و قوانین) کا اطلاق رعایا کی طرح حکمران و حکام پر بھی یکساں طور سے ہوگا اور سب ان کا احترام کرنے پر طوعاً و کرہاً مجبور ہوں گے۔ چھٹے، رعایا کو مفت و بلاتاخیر عدل دینا، حکومت و عدلیہ کی مشترکہ ذمے داری ہوگی۔ ساتویں، حسنِ آزادی و مساوات کے ایسے ماحول میں تشتت و افتراق اور عصبیت تضادات اور فساد و تنازعات کے امکانات بہت کم ہوں گے۔ آٹھویں، معاشرے میں سیاسی طور سے امن و امان ہوگا تو اس کے مثبت اثرات زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی پڑیں گے اور قوم پر ترقی و قوت حاصل کرنے کی راہیں کشادہ ہوتی جائیں گی۔

الغرض توحید اپنے فیوض و برکات کی بدولت سیاسی نظام کو مستحکم و مضبوط اور معاشرے کو امن و سلامتی اور خوشحالی ترقی کی مثالی جنت بنانے میں اہم کردار ادا کرنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ علاوہ بریں، اگر اللہ تعالیٰ کو ماننے والی اقوام اصولِ توحید کو عملاً تسلیم کریں تو دنیا میں بین الاقوامی اتحاد کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور اس میں عالمگیر دیا پائیدار امن قائم ہو سکتا ہے، جس کی بنی نوع انسان کو عصرِ حاضر میں اتنی زیادہ ضرورت ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ اس سے توحید کی قومی و بین الاقوامی غیر معمولی سیاسی اہمیت سے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

توحید اور معاشرتی نظام :

جس معاشرے کی اساس توحید پر استوار ہوگی اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہوگی کہ اس میں چار بڑے معاشرتی سرطان یعنی فرعون، ہامان، قارون اور آذر ناپید ہوں گے۔ یہ نہ ہوں گے تو معاشرتی برائیاں بھی نہ ہوں گی اور معاشرے میں کفر و شرک، جرم و گناہ، فحشاء و منکر، اوہام پرستی و اصنام پرستی، ظلم و استحصال، محکومی و غلامی، ذلت و مسکنت، بخل و تکاثر، اسراف و تبذیر، اکتناز و سود وغیرہ وغیرہ کا فقدان ہوگا۔ توحید کے مثبت اثرات یہ ہوں گے کہ افرادِ معاشرے میں اکثریت صاحبِ عدل و خلیق اور محسن و نیک کردار انسانوں کی ہوگی، جنہیں قرآنِ مجید صدیقین، شہداء اور صالحین سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن مجید کی رو سے یہ انسان اولیاء اللہ، نفوسِ مطمئنہ اور اہلِ جنت ہوتے ہیں۔

توحید سے معاشرے میں حسن یا جمال و جلال پیدا ہوتا ہے اور حسنِ معاشرت کے نتائج حسنِ خلق، اخوت و محبت، آزادی و مساوات، تکریمِ انسانی و ہمدردی، عدل و احسان، صدق و اخلاص، دوستی و رواداری اور شفقت و رحمت کی صورتوں میں نکلتے ہیں۔ اس طرح معاشرہ معاشرتی و اخلاقی اور نفسیاتی بیماریوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔

غور سے دیکھیں تو عقیدۂ توحید میں معرفتِ الٰہی مضمر ہے، جس کے لیے آج کل خدا آگہی اور خداشناسی کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ معرفتِ الٰہی انسان میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ، مثلاً عظمت و کبریائی، جمال و جلال، قدوسی و جبروت، سبحانی و صمدیت، رحمت و مغفرت اور علمِ کُلی و قدرتِ کاملہ وغیرہ وغیرہ کا شعور بیدار و فعال کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل پر انسان کا ایمان پختہ ہو جاتا ہے اور اس کا خوف اسے ایک طرف حسنِ عمل کی ترغیب دیتا ہے تو دوسری طرف اسے سیئہ و شر اور کبائر سے باز رکھنے میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، اگر انسان

سے کوئی گناہ سرزد ہو بھی جاتا ہے تو یہ خوف اس کے دل میں توبہ و استغفار کرنے کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔

یہ ہیں توحید کے معاشرتی تقاضے جن کو پورا کرنے سے معاشرہ حسین بنتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ حسنِ معاشرت معاشرتی برائیوں کو دور کرنے اور امن و سلامتی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ برخلاف اس کے توحید کے فقدان یا اس کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے سے معاشرے میں بشری سرطان پیدا ہو جاتے ہیں؛ جو راہزنِ ایمان و آگہی، غارتگرِ امن و سلامتی اور مردم خور و خون آشام ہوتے ہیں اور معاشرے کو جہنم اور افراد کو اہلِ نار بنا دیتے ہیں۔ اہلِ نار حقیقت میں زندہ ہوتے ہیں نہ مردہ۔ زندہ اس لیے نہیں کہ وہ لذّتِ زندگی سے آشنا نہیں ہوتے، اور مردہ اس لیے نہیں کہ انھیں اپنی آتشِ خوف و حزن کے کرب کا احساس و شعور ہوتا ہے۔

عقیدے اور عمل میں بُعد واقع ہو جائے تو وہ عمل سے پیدا ہونے والی قوّت و توانائی سے محروم ہو کر مضمحل و کمزور ہوتے ہوتے مُردہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جس معاشرے میں عقیدۂ توحید نحیف یا بے جان ہو جائے تو اس میں کئی قسم کی سرطانی اور دوسری نفسیاتی و معاشرتی بیماریاں وبا کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ اس صورتِ حال سے متأثر ہو کر اہلِ درد و نظر اصلاحِ معاشرہ کے لیے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں، لیکن ان کی مساعیِ جمیلہ عموماً اکارت جاتی ہیں یا ان کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ اس کی بنیادی وجہ معاشرتی سرطانیت ہوتی ہے، جس کا مطلب معاشرتی سرطانوں کی عملداری ہوتی ہے۔ معاشرتی سرطان شرک کے سبب پیدا ہوتے ہیں اور جب تک شرک کا قلع قمع نہ کیا جائے معاشرتی سرطانوں کا استیصال بھی ممکن نہیں ہوتا اور ان دونوں کو نیست نابود کیے بغیر اصلاحِ معاشرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ الغرض معاشرتی اصلاح کے لیے توحید بالعمل ناگزیر ہے۔ توحید بالعمل کا مطلب توحید کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے، جس سے

معاشرتی سرطانیت اور اصلاحِ معاشرہ دونوں کا علاج ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ توحید کے تقاضے کیا ہیں؟ کلمۂ طیبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ جو اسلام کا بنیادی عقیدہ اور اس کی تحریک کا لغرم ہے، ان تقاضوں کا آئینہ دار ہے۔ اس مختصر کلمے کی تنگنا میں بحرِ معانی کی وسعتیں سمیٹ لی گئی ہیں۔ اس کا پہلا لفظ لَا شرک کی نفی پر اور اِلَّا توحید کے اثبات پر دلالت کرتا ہے۔ "لَا" کا تقاضا ہے کہ شرک کے علمبردار و نقیب معاشرتی سرطانوں کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے۔ اِلَّا کا تقاضا حکومتِ الٰہیہ کا قیام ہے۔ حکومتِ الٰہیہ کی پہچان یہ ہے کہ اس میں مقتدرِ اعلیٰ یا حاکم الحاکمین فقط اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور اس کا حکم چلتا ہے، اور حکمران اللہ تعالیٰ کے نائب کی حیثیت سے اس کے احکام کے مطابق نظامِ حکومت چلاتا ہے؛ نیز اس میں معاشرتی سرطان ہوتے ہیں، نہ ان کی عملداری۔

مختصر یہ کہ توحید کے بنیادی تقاضوں لَا اور اِلَّا پر عمل کرنا ہے اور ان کو پورا کرنا اہلِ ایمان پر فرض ہے۔ غور کریں تو ایسا کرنے میں خود بنی نوعِ انسان کا اپنا فائدہ ہے۔ دلیل یہ ہے کہ معاشرتی سرطانوں کے ہوتے ہوئے وہ نہ تو اپنے انسانی حقوق حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں اپنا حصہ ہی لے سکتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان انسان دشمن سفاک بشری درندوں کی محکومی و غلامی، ستمگری و خون آشامی اور محتاجی و دست نگری، نیز ذلت و مسکنت سے محفوظ و مصئون نہیں رہ سکتے علاوہ بریں، ان کے لیے شرک و بت پرستی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں) کے دُور رس اور جانگسل منفی اثرات و نتائج سے بچنا بھی محال ہوتا ہے۔

توحید اور ثقافتی نظام:

ثقافت سے مراد زندگی کی جمالیاتی اقدار ہیں، جو اس کے گوشے گوشے میں

اپنی نمود رکھتی ہوں۔ اگر یہ کہا جائے کہ زندگی کی قدروں کو جمالیاتی یا حسین بنانے میں توحید مؤثر کردار ادا کرتی ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جملہ صفاتِ حسنہ یا جمالیاتی اقدار کا مالک ہے، لہٰذا جب کوئی شخص فرد ہو یا قوم اسے اپنا اِلٰہ و ربّ بنا کر اپنی زندگی میں جذب کر لیتا اور اس کی مشیّت یا عقیدۂ توحید کے مطابق فکر و عمل کرتا ہے تو اس کی زندگی میں حسن و نور پیدا ہو کر ارتقا کرنے لگتا ہے۔ یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ الحسن والحق ہے، اس لیے عقیدۂ توحید کے ہیولے میں حسن یا جمالیاتی اقدار مضمر ہیں۔ چنانچہ جب اہلِ ایمان اس عقیدے کو فکر و عمل کے ذریعے اپنی زندگی میں جذب کر لیتا ہے تو وہ جمیل و جلیل اور زندہ و حرکی (DYNAMIC) بن جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایسے افراد کی ثقافت بھی رنگِ جمال و جلال سے مزیّن، زندہ و پائیدار اور حرکی و ارتقائی ہوتی ہے۔ چونکہ افرادِ نسلِ انسانی کی جمالیاتی حس (AESTHETIC SENSE) میں وحدت اور جمالیاتی ذوق (AESTHETIC TASTE) میں کثرت پائی جاتی ہے، اس لیے ان کی قومی و ملّی ثقافت میں اختلاف و تنوع (یکثرت) پایا جاتا ہے، لیکن جمالیاتی حس اور عقیدۂ توحید کی بدولت ان کی ثقافت میں رنگِ وحدت بھی نمایاں ہوتا ہے۔

چونکہ ثقافت کُل زندگی کو محیط ہوتی ہے، لہٰذا اس کے مندرجہ ذیل شعبوں میں توحید کے تقاضوں اور مؤثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے: (۱) مصوّری و تبگری (۲) موسیقی (۳) شاعری (۴) ادب (۵) تعلیم و تربیت (۶) رسم و رواج۔

۱۔ مصوّری و تبگری:

اس فن کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ آذری فن ہے اور اس کی ایجاد و اختراع کے عوامل و محرکات میں شرک سرِفہرست ہے۔ شرک جو کہ توحید کی ضد و نقیض ہے، محسوس ہستی یا ہستیوں کی پرستش چاہتا ہے، چاہے یہ مجسّمے، مورتیاں، شبیہیں، قبریں، سمادھیاں، آستانے

مقامات، آثار ہوں یا حیوانی، نباتاتی، آبی اور سمادی اشیا رہوں؛ یا یہ پیر و فقیر، زاہد و مرتاض، درویش و ملنگ، راہب و مجذوب، مشائخ و پیشوا ہوں۔ بخلاف اس کے توحید ایسی ہستیِ مطلق کی پرستش کی متقاضی ہے جو نہ تو محسوس و مصوَّر ہے اور نہ اس کا کوئی مثیل و ثانی ہے؛ نیز وہ یکتا و یگانہ اور وحدہٗ لاشریک ہے۔ چونکہ انسان محسوس یا یا مادّی و مشہود دنیا میں رہتا ہے، اس لیے خوگرِ محسوس ہے؛ دوسرے یہ جبلّی طور سے تعجیل پسند ہے، لہٰذا یہ غیب پر حاضر اور تاخیر پر عجلت کو ترجیح دینے کا داعیہ رکھتا ہے۔ یہ داعیہ اس کو مشرک و بت پرست بنانے میں انتہائی مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔

چونکہ دین اصلاً ایک ہے اور جملہٗ انبیاء علیہم السلام ہر زمان و مکان میں ایک ہی دین لے کر مبعوث ہوئے تھے اور توحید کے داعی تھے، اس لیے ابتدا میں افرادِ نسلِ انسانی توحید کے پیروکار تھے۔ بعد میں جب ان میں معاشرتی سرطان پیدا ہوئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے بجائے لوگوں پر اپنا حکم چلانے، ان کا استیصال کرنے اور ان کے حصّے کی خداداد نعمتوں اور ان کی کمائی کو خود ہضم کرنے کی خاطر آزری سلطانوں یا مذہبی پیشواؤں کو پیدا کیا اور ان کی سرپرستی کی تاکہ وہ دین میں بدعت و تفرقہ اور لوگوں میں تشتّت و افتراق پیدا کریں، ان میں فرقے بنائیں، نیز ان کو آپس میں لڑاتے رہیں اور متحد و متفق نہ ہونے دیں اور ان کی قوّت کو کمزور کرتے رہیں اور اس کے نتیجے میں وہ ان کے ظلم و ستم، جور و جفا اور استحصال و ناانصافی کے خلاف نہ تو علمِ بغاوت بلند کرسکیں اور نہ احتجاج ہی کرسکیں۔ علاوہ ازیں، وہ اپنی محرومی و نامرادی، ذلّت و مسکنت اور محکومی و غلامی کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر خاموش و مجہول رہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں حسنِ زندگی اور انقلاب کی آرزو نشوونما نہ پانے پائے۔ آزری پیشوا یہ سب کچھ اس وقت نہیں کرسکتے تھے جب تک اہلِ ایمان عقیدۂ توحید سے عملاً منحرف نہ ہو جاتے یا اس میں شرک کی آمیزش نہ کردی جاتی۔ چنانچہ انہوں نے اس مقصد کی خاطر تاویل باطل

اور تسمیہ بالباطل کے ابلیسی فنون ایجاد کیے۔

تاویل بالباطل کا مطلب وحی و تنزیل کے الفاظ و آیات کی ابلیسانہ انداز میں توضیح و توجیہہ کر کے ان میں اپنے مطلب کی تحریف کرنا ہے۔ تحریف تین قسم کی ہوتی ہے لفظی، معنوی اور موضعی۔ لفظی تحریف کا مطلب مطلوبہ معنوی تبدیلی کی خاطر اصل الفاظ یا عبارت کو بدل دینا، ان کو جزوی یا کُلّی طور پہ حذف کر دینا یا ان میں اضافہ کر دینا ہے۔ معنوی تحریف کا مطلب اصل معنیٰ و مفہوم میں اپنے مطلب کی تبدیلی لانے کی خاطر مفردات و آیات کی غلط تفسیر و تاویل کرنا ہے۔ موضعی تحریف سے مراد الفاظ و عبارت کو الٹ پلٹ کر دینا یا ان کے موضع و مقام کو بدل دینا ہے تاکہ ان کے معانی و مفہوم میں مطلوبہ تبدیلی پیدا ہو جائے۔

تسمیہ بالباطل بھی انتہائی خطرناک ابلیسی۔ آزری فن ہے۔ یہ اسم بے مسمّیٰ ایجاد و اختراع کرنے کا فن ہے۔ اس کا مطلب کسی شخص یا ہستی کو ایسے نام سے موسوم کرنا یا ایسی صفت سے موصوف کرنا ہے، جس میں نہ تو اس نام کا معنیٰ اور نہ اس میں وہ صفت ہی پائی جائے۔ تسمیہ بالباطل آزروں کے حوالے سے کسی زندہ، مردہ یا بے جان ہستیوں کو صفاتِ الٰہیہ سے موصوف کرنے کا فن ہے۔ مثال کے طور پہ اللہ تعالیٰ کے کسی برگزیدہ بندے کو "ابن اللہ" کہنا تو کسی کو داتا، کسی کو مشکل کشا و دستگیر کہنا تو کسی کو کارساز و ضامن۔ علاوہ ازیں، ربِّ جلیل جو وحدہٗ لا شریک ہے، اس کی خدائی میں اس کے برگزیدہ بندوں کو شریک سمجھنا، ان کے متعلق یہ عقائدِ باطلہ رکھنا کہ وہ سمیع و بصیر، مستجیب الدّعوات، زندہ و حاضر و ناظر، حاجت روا و کارساز، ارض و سمٰوٰت کے خالق و پروردگار اور عزیز و قدیر ہیں۔

چونکہ تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے ابلیسی۔ آزری فنون آزری پیشوائیت کے ادارہ کے قیام و قبولِ عام کے لیے ناگزیر ہیں، لہٰذا یہ اس کی میراث ہیں۔ آزری

سرطانیت اس لحاظ سے فرعونی، ہامانی اور قارونی سرطانیت سے زیادہ خطرناک و مہلک ہے کہ اس کے زہرِ شرک سے ایک تو مشرک کی شخصیت پارہ پارہ ہوجاتی ہے، اور اس میں وحدت نہیں رہتی جس کے باعث اس کے جمالیاتی ارتقاء کا امکان مفقود ہوجاتا ہے۔ دوسرے اس کے قلب کا نور بجھ جاتا ہے اور وہ اندھا ہوجاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ حُسنِ زندگی اور اطمینان و سرور سے محروم ہوکر اہلِ نار بن جاتا ہے۔

الغرض، ان ابلیسی فنون کے ذریعے آزری پیشوائیت نے دین میں شرک و بدعات کی آمیزش کردی اور معاشرے میں مشرکانہ رسومات کو مروج کردیا اور لوگ سب کو عبادت سمجھ کر کرنے لگے۔ پھر مشرکوں کو اپنا مریدِ محکوم اور مطیع و منقاد بنا کر ان کا زیادہ سے زیادہ استحصال کرنے، ان سے نذرانے اور چڑھاوے وصول کرنے اور مشرکانہ رسم و رواج کی زنجیروں میں انھیں مضبوطی سے جکڑنے کی خاطر انھوں نے بتگری و مصوری کا فن ایجاد کیا اور اپنی فنی تخلیقات کو تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کے ابلیسی فنون کے ذریعے لوگوں کے معبود قرار دیا؛ ان کے لیے بت خانے تعمیر کیے اور ان کی پوجا کو دین کا جزوِ لاینفک بنا دیا۔ چونکہ توحید شمعِ حُسن و نور اور شرک غارتگرِ حُسن و نور ہے، لہٰذا مشرکوں اور کافروں کی ثقافت حُسن و نور سے محروم ہوجاتی ہے۔

ظہورِ اسلام کے وقت مشرق و مغرب کی اقوام کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ کو شرک نے ان کے جمال و جلال اور حیات و توانائی سے محروم کردیا تھا اور بت پرستی ان کی ثقافت کا جزوِ لاینفک بن چکی تھی، اس کے نتیجے میں ان کی زندگی کے باطنی و ظاہری ہر گوشے میں فساد برپا ہوچکا تھا۔ ربِّ علیم و حکیم کے نزدیک اس عالمگیر و ہمہ گیر فساد کا ایک ہی مؤثر و مجرّب علاج تھا اور وہ عقیدۂ توحید تھا۔ تاریخِ ادیانِ عالم شاہد ہے کہ توحید ہی شرک و بت پرستی کے زہر کا تریاق اور معاشرتی سرطانوں کے لیے زہرِ ہلاہل ہے۔ اصل یہ ہے کہ توحید کے ہیولے میں امن و سلامتی اور وحدت کی صورت اور شرک

کے ہیولے میں خرابی و فساد کی صورت مضمر ہے۔ یہ بھی بدیہی حقیقت ہے کہ توحید اور شرک ضدین ہیں اور اجتماعِ ضدین محال ہے۔ اس سے مستنبط ہوا کہ توحید ہو تو شرک نہیں ہوتا اور شرک نہ ہو تو بت پرستی بھی نہیں ہوتی۔ اس سے اس امر کی توجیہہ ہو جاتی ہے کہ کیوں اسلام نے دین کے ہر گوشے میں توحید کے غلبہ و تسلط کو قائم کرنے کی خاطر اس پر شرک و بت پرستی کے دروازے بند کر دیے۔

ازمنۂ قدیم اور قرونِ وسطیٰ میں بت گری و مصوری کا بنیادی مقصد بت پرستی تھا۔ اس لیے اسلام نے بتگری کی حوصلہ شکنی اور بت شکنی کی حوصلہ افزائی کی؛ نیز اس نے بتگری کو شیوۂ آزری اور بت شکنی کو سنتِ ابراہیمیؑ قرار دیا۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک انسان کی ہر فنی فعلیت یا فنی تخلیق جس کے مقاصد میں شرک یا بت پرستی مضمر ہو، حریفِ توحید اور حرام ہے۔ البتہ جو تصویریں پاسپورٹ، شناختی کارڈ، لائسنس، اشتہار، تشہیر یا یادگار کے طور پر بنائی جائیں یا کیمرے وغیرہ سے لی جائیں، جائز ہیں۔ غیر بشری تصاویر جو جمالیاتی، فنی، ادبی، علمی وغیرہ وغیرہ مقاصد کے لیے استعمال کی جائیں، جائز ہیں۔ البتہ اصنافِ جلیلہ و متحرکہ کی عریاں و نیم برہنہ یا جنسی تحریک دینے والی تصویریں ناجائز و حرام ہیں۔

تاریخِ جمالیات اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اسلام کی تحریکِ توحید نے انسانی ثقافت اور اس کے فنونِ لطیفہ کی تطہیر و تزکیہ کرنے، یعنی انہیں شرک بت پرستی کی سرطانیت سے پاک و صاف کرنے اور ان میں حسن و زندگی پیدا کر کے ان کا نشو و ارتقا کرنے میں مؤثر و نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم اپنی تاریخِ جمالیات سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں:

"ساتویں صدی میلادی کا آغاز عالمِ انسانی کی تاریخ میں اس وجہ سے ازبس بدنام ہے کہ اس عہد میں بت پرستی اپنے انتہائی عروج پر پہنچ چکی تھی، جس کے سبب نوعِ انسانی ذلت و تفسخ کی انتہائی پستی میں گر کر دم توڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ عہد تاریخ میں

اس وجہ سے بھی ازبس اہمیت اور شہرت رکھتا ہے کہ اسی زمانے میں اسلام کی عالمگیر تاریخِ توحید کا آغاز ہوا جس نے انسان کو اس پستی سے نکالنے اور اس کے تنِ مردہ میں حسن و زندگی کی روح پھونکنے کی بے مثال و کامیاب کوشش کی۔ تاریخِ جمالیات میں یہ تحریکِ توحید اس وجہ سے نہایت اہم سمجھی جاتی ہے کہ اس نے تاریخ جمالیات کا رخ حسین و صحیح سمت میں بدل کر ایسا کارنامہ سرانجام دیا جو آپ اپنی مثال ہے۔ اسی تحریک کی وجہ سے عالمِ عیسائیت میں تحریکِ بت شکنی کا آغاز ہوا، جس نے فن کو مذہب کی خود ساختہ قیود سے رہا کرانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ اس عہد میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے مجسموں کی کھلم کھلا پرستش ہوتی تھی، لیکن اسلام کی تحریکِ توحید کے بے پناہ وہمہ گیر اثر و نفوذ اور اس کی حیرت انگیز کامیابی سے متأثر ہو کر اربابِ کلیسا نے بت پرستی کی باطلیت کو محسوس کیا اور اس سے متعلق اپنے نظریات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ کلیسا کی اس تحریکِ بت شکنی کا زور ۷۲۶ء سے ۸۵۰ء تک رہا۔ اس تحریک کا آغاز عملی شکل میں شہنشاہ لیوہی عیسورین LEO THE ISAURIAN کے اس فرمان سے ہوا تھا جس کی رو سے گرجوں میں بت پرستی کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ شہنشاہ لیو نے یہ فرمان اسلام کی تحریکِ توحید کی ناقابلِ تسخیر قوت سے متأثر ہو کر ہی جاری کیا تھا۔ اس شاہی فرمان نے مشرقی کلیسا میں خاص طور سے ہیجان برپا کر دیا۔ چنانچہ اس مسئلے کو قطعی طور پر حل کرنے کے لیے ۷۵۴ء میں اربابِ کلیسا کا ایک بہت بڑا اجلاس قسطنطنیہ میں منعقد ہوا۔ جو "قسطنطنیہ کی کونسل" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کونسل میں تین سو اڑتالیس اسقفوں نے حصہ لیا اور بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس بارے میں یہ فتویٰ صادر کیا گیا:

"یسوعؑ اپنی مشترک انسانیت میں اگرچہ غیر جسمانی نہیں تھا، لیکن پھر بھی وہ حیاتی نوعیت کے تمام حدود اور نقائص سے ارفع و اعلیٰ تھا۔ لہٰذا وہ اتنا رفیع المرتبت ہے کہ انسانی فن کی صنف میں بھی اس کی شبیہہ کشی نہیں کی جا سکتی، جیسی کہ دوسرے انسانی

جسم کی ممکن ہے'' (A HISTORY OF AESTHETICS، B.BOSANQUET، ص ۱۴۸)۔
اس فتوے کی بنا پہ اس کونسل نے ان تمام اشخاص کو ملحد قرار دے دیا جنہوں نے عیسائی تثلیث کے اقانیم ثلاثہ کو رنگوں میں متشکل کرنے کی کوشش کی تھی، اور اولیاؔ (SAINTS) کی بے جان و گنگ تصویریں بنائی تھیں، جن کا نہ کوئی فائدہ تھا اور نہ مقصد۔

اس تحریکِ توحید کا ایک فوری نتیجہ یہ نکلا کہ فن نے مذہب کی غلامی سے خاص حد تک نجات حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ ذہنِ انسانی بھی حقیقی جمالیاتی قدروں سے آگاہی حاصل کرنے لگا، اور انسان کی فکر و نظر کے سامنے حُسن و فن کے حقائق منکشف ہونے لگے، جس کی وجہ سے تاریخِ جمالیات رفتہ رفتہ ایک نئی روش پہ چلنے لگی''
(نصیر احمد ناصر: تاریخِ جمالیات، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، جلد اوّل، ص ۲۲۱-۲۲۲)۔

موسیقی:

نگمری و مصوّری کی طرح موسیقی بھی معاشرتی سرطانوں کی سطوت و سیادت، ہیبت و جبروت اور خصوصاً آزری پیشوائیت کی وجہ سے معبودانِ باطلہ کی، جن میں خود معاشرتی سرطان بھی شامل تھے، تعریف و ستائش کرنے، ان کی شان میں بھجن، قصیدے گیت وغیرہ وغیرہ گانے کے کام آتی تھی۔ اب بھی اس سے یہ کام لیا جاتا ہے، اگرچہ اب اس کا ایک بڑا مقصد جمالیاتی ذوق کی تسکین کرنا بھی ہے۔ اگرچہ مشرکین غیر اللہ کی بھی اسی طرح حمد و ثنا کرتے ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ کی کرتے ہیں یا کرنی چاہیئے، لیکن آزری پیشوائیت نے تاویل بالباطل اور تسمیہ بالباطل کے ابلیسی فنون کے ذریعے چونکہ اس کو مختلف ناموں سے موسوم کر دیا ہے، لہٰذا لوگ اس جمالیاتی فریب میں آ کر اپنے اس مشرکانہ فعل کو عبادت و نیکی سمجھ کر کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں شرک سے تائب ہونے کی آرزو پیدا ہی نہیں ہوتی، لہٰذا ان کے موحّد بننے کا امکان ہی نہیں رہتا۔

اُمّتِ مسلمہ میں بھی بعض فرقے ایسے ہیں، جو موسیقی سے مشرکانہ کام لیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو توحید پرست کہتے اور سمجھتے ہیں ؛ حالانکہ قرآنِ مجید کی روُ سے توحید کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ تنہا اللہ تعالیٰ حمدوثنا کا سزاوار ہے، لہٰذا صرف اسی کی حمدوثنا کرنی چاہیے۔ چنانچہ جس گلِ نغمہ سے شرک و بت پرستی کی بوُ آئے، وہ حرام ہے۔

موسیقی حسنِ آواز ہے، لہٰذا یہ جمالیاتی یا حسین مقاصد کے لیے ہونی چاہیے مثلاً جمالیاتی حِسّ و ذوق کی تسکین یا جمالیاتی سوز و ساز حاصل کرنے کے لیے ہونی چاہیے۔ اس سے غیراللہ کی حمدوثنا یا پرستش کا کام لینا، حسنِ آواز ایسی نعمتِ حسنیٰ کی تکفیر، نیز نفیِ توحید اور شرک ہے۔ اسلام کی غایتِ حقیقی شرک کا اِستیصالِ کُلّی اور توحید کو ہر گوشۂ دین پر غالب کرنا ہے، لہٰذا اس بنا پر اس نے موسیقی کی حوصلہ شکنی کی تاکہ اُمّتِ مسلمہ بالخصوص اور دیگر اقوام بالعموم اسے شرک و بت پرستی کے لیے استعمال نہ کرے۔ اس اعتبار سے توحید نے موسیقی کو معاشرتی سرطانوں کا آلۂ کار بننے اور شرک و بت پرستی کے کام آنے سے باز رکھنے میں قابلِ ستائش کردار ادا کیا ہے اور کر رہی ہے۔

شاعری :

غنایت کی طرح شعریت بھی سحر ہے، کیونکہ یہ دونوں حسن ہی کی دو تعبیریں ہیں اور حسن میں تأثیرِ جمال و جلال ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شعر میں اہلِ ذوق کو سرخوشی و سرمستی سے سرشار اور کیف و سُرور سے مسحور کرنے کی تاثیر ہوتی ہے۔ شعریت کی خوبی یہ ہے کہ اس میں الفاظ و صورت کے حسن کا امتزاج ہوتا ہے۔

شعر کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کی نشوونما میں معاشرتی سرطانوں کی سرپرستی نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری سے بھی معاشرتی سرطانوں کی حمدوثنا

قصیدہ خوانی اور ان کے اوصاف بیان کرنے میں حد سے زیادہ مبالغہ آرائی کرنے کا کام لیا جاتا تھا ؛ کم ہی سہی ، لیکن اب بھی لیا جاتا ہے ۔ جہاں تک آزری سرطانوں کا تعلق ہے ، انھوں نے بھی دین و مذہب ، برگزیدہ ہستیوں ، آئمہ و مشائخ ، صوفیہ و اولیاء اللہ کی محبت کے نام پر شاعری سے شرک و بت پرستی کی تشہیر کا کام لیا ہے اور لے رہے ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ اس طرح ان کی پیری و مشیخت اور سجادہ نشینی و مجاوری کا کاروبار چلتے رہنے میں مدد ملتی رہتی ہے ۔ اگر یہ کہا جائے کہ شاعری پر آزری سرطانوں کے غلبے کے سبب اس کا رشتہ توحید سے بہت حد تک منقطع ہو گیا ہے اور وہ رنگِ شرک سے مزیّن ہے تو یہ مبالغہ نہ ہو گا ۔

شعر میں مبالغے کو روا رکھا جاتا ہے ، بلکہ اس کا حسن سمجھا جاتا ہے ۔ اس کا نتیجہ ہے کہ جب شاعر کسی برگزیدہ ہستی کی شان اور حمد و ثنا میں مبالغہ آرائی کرتا ہے تو زورِ بیان میں توحید کی حدود کو پار کر کے شرک کی وادیوں میں دور نکل جاتا اور بھٹکنے لگتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے قرآنِ مجید میں شاعروں کے تتبّع سے منع فرمایا ہے ۔ اردو و فارسی کی شاعری ہمارے دعوے کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے ۔

توحید ہر حال میں سچ کی متقاضی ہے ، کیونکہ عقیدۂ توحید حق ہے ۔ بخلاف اس کے شرک کی بنیاد ہی باطل پر استوار ہوتی ہے ، اس لیے یہ جھوٹ چاہتا ہے ۔ چونکہ شعر میں کذب و باطل کو حسنِ مبالغہ سمجھ کر روا رکھا جاتا ہے ، اس لیے ہماری شاعری کو بالخصوص شرک راس آتا ہے ؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری شاعری کلیتاً شرک کی آئینہ دار ہے ۔ شعر توحید کا آئینہ دار ہو تو اس میں برقِ حسن مضمر ہوتی ہے ، جس میں تزکیۂ نفس اور احیائے قلب کرنے ، نیز سوز و ساز کی جمالیاتی ثروت دینے اور جمالیاتی ارتقاء کرنے کی تاثیر ہوتی ہے ۔ یہ نکتہ قابلِ غور بھی ہے اور یاد رکھنے کے قابل بھی کہ معاشرتی سرطانوں نے اہلِ ایمان کو جمالیاتی فریب دینے

اور اس میں مبتلا رکھنے کی خاطر تسمیہ باالباطل اور تاویل باالباطل کے ابلیسی فنون کے ذریعے شعر کی مشرکانہ اصناف کو خوشنما ناموں سے موسوم کر رکھا ہے۔ چونکہ شعر میں سحر ہوتا ہے، اس لیے اکثر اہلِ ذوق بھی اس سے مسحور ہو جاتے ہیں اور شرک ان کی نظر میں توحید کی طرح حسین و دلکش دکھائی دینے لگتا ہے۔

اس بحث سے ہم یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ شاعری کو شرک کی نظر فریب "سرطانیت" سے پاک و صاف کرنے اور حسن و حق کا آئینہ دار بنانے کی خاطر اُسے معاشرتی سرطانوں کے اثر و رسوخ اور محکومی و غلامی سے آزاد کرانا لابدی ہے۔ اس حقیقت کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ جب تک معاشرتی سرطان معاشرے پر مسلط ہیں، شعر کو ان کے چنگل سے چھڑانا اور ان کے اثر و سیادت سے آزاد کرانا محال ہے، لہٰذا اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے توحید کی تحریکِ انقلاب کے ذریعے معاشرتی سرطانوں کا استیصالِ کُلّی۔

ادب:

اسلام کی تحریکِ توحید کے آغاز کے وقت اقوامِ عالم کا ادب زیادہ تر اساطیری کہانیوں یا دیو مالا پر مشتمل تھا، جو عموماً رنگِ شرک سے مزین تھیں۔ ان کہانیوں کو دلکش اور لوگوں میں مقبول بنانے کی خاطر ان کی بنیاد مافوق العادت واقعات و سانحات اور خوارق و کرامات پر رکھی جاتی تھی۔ ایسا ادب شرک و بت پرستی کی ترویج و تشہیر میں مؤثر کردار کرتا اور توحید کے عقائدِ جلیلہ و محرکہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتا تھا۔ علاوہ بریں، ہر قوم کا ادب شرک کے باعث فسادِ فکر و نظر کا غماز تھا۔ اسلام کی تحریکِ توحید مشرکانہ مذاہب کے لیے زبردست چیلنج تھی۔ چونکہ باطل بنیادی طور سے بودا ہوتا ہے، لہٰذا وہ حق کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اس لیے مذاہبِ باطلہ شرک

کے الزام سے بچنے اور اپنے آپ کو توحید پرست ثابت کرنے کی خاطر علاوہ اور باتوں کے ایسا ادب تخلیق کرنے لگے، جس میں کم سے کم شرک کی آمیزش ہوتی تھی۔ چنانچہ اہلِ قلم اپنے قومی مشرکانہ عقائد و نظریات اور افکار و توہمات کے اظہار کے لیے ایسے الفاظ و اسالیب اختیار کرنے لگے، جو اِخفائے شرک کے لیے موزوں ہوتے اور ان میں رنگِ توحید اپنی نمود بھی رکھتا۔

جہاں تک نومسلم اقوام کا تعلق ہے، انہوں نے ایسا ادب تخلیق کیا، جو بہت حد تک شرک سے پاک و منزہ اور رنگِ توحید سے مزیّن تھا۔ ایسے حسین و طیّب ادب نے دُنیا کے دیگر مصنّفین کی فکر و نظر کو بدلنے میں قابلِ ستائش کردار ادا کیا چنانچہ وہ اپنے ادب میں اپنے مشرکانہ عقائد و نظریات کو پیش کرنے سے احتراز کرنے اور اپنی ادبی تخلیقات کو رنگِ توحید سے آراستہ کرنے لگے۔

زندگی کی طرح ادب کا حسن و معنیٰ بھی اللہ تعالیٰ یعنی عقیدۂ توحید ہے جو جلیل و حرکی ہے اور اس میں قوّتِ تزکیہ و اِحیاء ہے؛ لہٰذا اس میں فکر و نظر کو حسین و منوّر بنانے اور اسے زندگی کی حسین و مستقیم راہ پر چلانے کی حیرت انگیز تاثیر پائی جاتی ہے چنانچہ ادیب اگر موحّد ہو اور اپنی تخلیقی صلاحیّت کو عقیدۂ توحید کی جلیل و حرکی اور مزکّی و اِحیائی قوّت کے ساتھ استعمال کرے تو وہ زندہ و طیّب اور حسین و منوّر ادب تخلیق کرنے کے قابل ہو سکتا ہے بخلاف اس کے جو ادیب مشرکانہ عقائد کے حوالے سے ادب تخلیق کرتا ہے، اس کا قبیح و مردہ اور مضرّت رساں ہونا لابدی ہے۔ شرک جمالیاتی اقدار کا دشمن و غارتگر ہے، لہٰذا وہ ادبی تخلیقات کے حُسنِ معنوی کو برباد یا اس میں قبح کی آمیزش کر دیتا ہے۔ ایسا ادب قاری کے قلب پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے، اور اس طرح اس کی فکر و نظر اور عقل کو سقیم و حسن کورا اور گمراہ و عیّار بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ہمیں اس حقیقت سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے کہ زندہ و حسین ادب سے

اگر جذبات کی تطہیر و تحسین ہوتی ہے تو مردہ و قبیح ادب جذبات کو ناپاک و گندہ کرتا ہے۔ علاوہ بریں ادب میں روحِ توحید اگر قاری کو اس کے اِلٰہ و ربّ کے قریب کرتی ہے تو شرک کی روح اُسے اس سے دور کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دوری کا مطلب انسان کا اپنے حُسن و نور سے اور لذّتِ زندگی سے محروم ہونا ہے؛ اور یہ محرومی حقیقت میں اس کی حقیقی محرومی و ناکامی ہے۔ مختصر یہ کہ فکر و نظر ہو یا دل و دماغ، ادب و فن ہو یا سائنس و ہنر، کوئی شے بھی ہو، اپنے حُسن و نور اور حیات و بقائے دوام کے لیے عقیدۂ توحید کے جمال و جلال اور اس کی قوّتِ تزکیہ و احیاء کی بہت حد تک مرہونِ منّت ہوتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان نے اللہ تعالیٰ کو جو اس کا حقیقی معروضِ حسن و عشق ہے، ادب و فن سے نکال کر اپنے آپ پر ظلمِ عظیم کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بے خدا ادب نے اسے حسن و کور ذوق، خدا ناشناس و خود ناشناس، نخچیرِ احساسِ تنہائی، رہینِ خوف و حزن اور اہلِ نار بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

تعلیم و تربیت:

توحید کے حوالے سے تعلیم و تربیت کا اوّلین مقصد بچے میں علم و ہنر کی طلب و جستجو پیدا کرنا یا سچا طالبِ علم بنانا ہے۔ دوسرے اس میں مضمر حسّی و قلبی استعدادوں کو قوت سے فعل میں لانا ہے تاکہ وہ کائنات کی تسخیر کرنے کے قابل اور خدا آگاہ و خود آگاہ بن جائے، اور اس کے دل میں اس کے اِلٰہ و ربّ کی محبّت کی شمعِ خاموش فروزاں ہو جائے؛ اور اس کا نورِ باطنی حرکی و ارتقائی ہو جائے، علاوہ بریں، اس کی جمالیاتی حِس زندہ و فعّال ہو جائے اور وہ اپنے اِلٰہ و ربّ کی حسین تخلیقات خصوصاً بنی نوع انسان سے محبّت کرے اور سب کے لیے رحمت بن جائے۔

ہمیں یہ حقیقت نہیں بھولنی چاہیے کہ علم وٹیکنالوجی میں تسخیرِ کائنات کی قوت ہوتی ہے اور اس کے ذریعے انسان مادی اِرتقاء کرنے کے قابل بنتا ہے۔ جہاں تک نورِ باطنی کا تعلق ہے، اس میں اِرتقاء کرنے کے لامتناہی امکانات ہوتے ہیں، جو حُسنِ یقین و عمل کے ذریعے قوت سے فعل میں آتے رہتے ہیں۔

تربیت کو اصطلاحِ قرآنی میں تزکیہ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے قلب (= دل و دماغ) اور نفس کو بیماریوں اور دیگر منفی اثرات سے پاک وصاف کر کے اسے نورانی یا جمالیاتی اعتبار سے اِرتقاء کرنے کے قابل بنانا ہے۔ تزکیہ سے خُلق میں حسن پیدا ہوتا ہے، یعنی وہ جمیل و جلیل اور عظیم بنتا ہے۔ حُسنِ خُلق سے عدل واحسان اور محبت و رحمت اور تقویٰ وصالحیت کے چشمے پھوٹتے ہیں، جو مزرعِ حیات کو سرسبز و شاداب اور زرخیز و بارآور بناتے ہیں۔ الغرض، علم و تزکیہ سے انسان میں عقیدۂ توحید نشو و نما پاتا اور مضبوط و محکم بنتا ہے۔

اس بحث سے ہم یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ تعلیم و تربیت کی غایتِ حقیقی انسان کو موحّد بنانا ہے اور موحّد کا مطلب ہے مؤمن وصالح۔ مؤمن کی پہچان یہ ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی آگہی و محبت کی شمع روشن ہوتی ہے جس کے نور و توانائی سے نفس جمالیاتی اِرتقاء کرتا ہے۔ صالح سے مراد وہ صاحبِ کردار انسان ہے، جو علم وٹیکنالوجی کے نور و توانائی سے تسخیرِ کائنات کرنے اور مادی ارتقاء کرنے کی آرزو رکھتا ہو اور حتّی المقدور کوشش بھی کرتا ہو، نیز جس کے حُسنِ خُلق و کردار سے معاشرے میں امن و سلامتی پیدا ہوتی ہو۔

اگر ہم مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمارا نصابِ تعلیم و تربیت کفر و شرک کے ہر عقیدہ و نظریے سے پاک وصاف اور توحید کے عقائدِ جلیلہ و محرّکہ کے عین مطابق ہونا چاہیے۔ اس احسن واکمل نصاب کی قرآنِ مجید نے نشاندہی اور جا بجا صراحت بھی کر

دی ہے۔ آخر میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے کہ مسلم اقوام کی ذلّت و مسکنت، پس ماندگی و کمزوری، محتاجی و دست نگری اور ایٹمی توانائی و ٹیکنالوجی سے محرومی کا ایک بنیادی سبب ان کے نظامِ تعلیم میں نصابِ قرآنی کا فقدان ہے، خاص کر مدارسِ نظامیہ میں، جنھیں "دینی" مدارس کہتے ہیں۔ یہ واقعیت اُمتِ مُسلمہ کی قرآنِ حکیم سے دُوری و مہجوری کا زندہ ثبوت ہے۔

مسلم اقوام کے نظامِ تعلیم میں ثنویت پائی جاتی ہے؛ یعنی اس میں سیکولر اور نظامیہ نصابِ تعلیم رائج ہیں، اور ان دونوں میں نصابِ قرآنی کا فقدان ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نظامِ تعلیم کا رشتہ توحید سے منقطع ہو چکا ہے، یا برائے نام رہ گیا ہے۔

اصل یہ کہ جب تک توحید زندگی کے ہر شعبے اور گوشے پر غالب نہ ہو جائے، وہ طیّب و منوّر اور احسن و اکمل یا قرآن و سُنّت کے مطابق نہیں بن سکتی، بالفاظِ دیگر، وہ اسلامی یا مثالی نہیں بن سکتی۔ چنانچہ حسب اللہ تعالیٰ اپنے آخری کلام قرآنِ مجید میں یہ فرماتا ہے کہ دینِ اسلام کُل دین پر غالب آکر رہے گا تو اس سے مراد دینِ توحید ہوتا ہے۔ اس ارشاد میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ توحید دین کے ہر شعبہ و گوشہ پر غالب آجانے کی قوت رکھتی ہے اور غالب ہو کر رہے گی، اس لیے کہ اقوامِ عالم اپنے مشاہدہ و تجربے اور ضرورت و حاجت کی بنا پر اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گی چونکہ توحید کا کوئی متبادل ہے نہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آتشِ خوف و حزن سے محفوظ رہنے، امن و سلامتی کی حیاتِ طیبہ گزارنے اور نورانی یا جمالیاتی ارتقاء کرنے کی خاطر اقوامِ عالم دینِ توحید کو کُلّی طور پر قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ اُمتِ مسلمہ سمیت سب اقوامِ عالم کو ایسے نصابِ تعلیم کی حاجت ہے، جو طلباء کو "صالح" بنائے تاکہ ان کا معاشرہ سرطانی و دیگر برائیوں سے پاک و صاف، خوشحال و ترقی یافتہ اور امن و سلامتی کی جنّت ہو؛ نیز اس کے افراد آزاد و مکرّم، جفاکش و مطمئن اور خوش اخلاق و اہلِ حسن و سُرور ہوں۔ اکثر

اقوام کو ایسے نصاب کی طلب و جستجو بھی ہے، لیکن مسلمانوں سمیت ان کے جہل کی انتہا یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کا شعور نہیں رکھتیں کہ یہ مثالی نصابِ تعلیم چودہ صدیوں سے قرآنِ حکیم میں محفوظ ہے اور مدرسۂ نظامیہ کے قیام سے پہلے یہ مسلمانوں کا نصابِ تعلیم بھی تھا، جس کی بدولت انہوں نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بے مثال ترقی اور اقوامِ عالم کی امامت کی۔

اُمّتِ مسلمہ کے عروج و زوال کی تاریخ کا ژرف نگاہی سے مطالعہ بالحق کریں تو ہم یہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی ہمہ گیر و عالمگیر ترقی قرآنِ مجید کے نصابِ تعلیم کی مرہونِ منّت تھی تو ان کی پسماندگی و ضعیفی، جمود و تعطّل اور ذلّت و مسکنت کا سبب اس سے مہجوری ہے۔ اس سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ مسلم اقوام کی نشاۃ الثانیہ اور احیائے اسلام کا انحصار ہمارے اس عمل پر ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم و تربیت میں قرآنِ مجید کا نصاب رائج کریں اور اس کے مطابق جملہ درسی کتب تیار کریں، غرضیکہ اپنے معاشرے کو اسلامی و مثالی اور افراد کو موحّد و صالح بنانے کی خاطر ہمارے لیے اپنے نظامِ تعلیم کو توحید کی اساس پر استوار کرنا اور اس میں نصابِ قرآن کو ابتداء سے آخر تک رائج کرنا ناگزیر ہے۔

رسم و رواج :

ثقافت سے توحید کی روح نکل جائے تو اس کے نتیجے میں ایک تو وہ اپنے حُسن و نور اور حیات و قومیت سے محروم ہو کر قبیح و تاریک اور مردہ و ناپائیدار ہو جاتی ہے، اور دوسرے اس میں معاشرتی سرطان نشوونما پا کر اس پر مسلّط ہو جاتے ہیں اور افرادِ معاشرہ کو مشرکانہ و جاہلانہ رسوم کے طوق اور زنجیروں میں جکڑ لیتے ہیں۔ قرآنِ مجید شاہد ہے کہ اسلام کی تحریکِ توحید کا ایک مقصد بنی نوعِ انسان کو مشرکانہ رسم و رواج کے طوق و سلاسل سے رہائی دلانا ہے (الاعراف ۷ : ۱۵۷)۔

مثل مشہور ہے کہ گناہ شیریں ہوتا ہے۔ شرک بھی چونکہ گناہ بلکہ سب سے بڑا اور ناقابلِ معافی گناہ ہے، اس لیے یہ سب گناہوں سے زیادہ شیریں ہے۔ لوگوں کی اس کی طرف بہت جلد مائل و راغب ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر جرم و گناہ کی طرح شرک کو بھی جو ظلمِ عظیم ہے، ابلیسی نفس شیطان اپنی جالیاتی فریب کاری و وسوسہ اندازی کے ذریعے نظر افروز و دلکش اور دلفریب و شیریں بنا کر دکھاتا ہے اور انسان اس "حسین" دھوکے میں مارا جاتا ہے۔ انسان نے بساطِ زندگی پر ہمیشہ شیطان کے اسی مہرے سے شہ و مات کھائی ہے۔

اہلِ ایمان کا عقیدۂ توحید کمزور و مضمحل یا مردہ ہو کر اپنے جلال و جبروت اور قوت و توانائی سے محروم ہو جائے تو ان کے معاشرے میں "دینی" قیادت آذروں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ ان آذروں کی تسمیہ بالباطل اور تاویل بالباطل کی شعبدہ بازی سے مفتون ہو کر صرف یہ نہیں کہ لوگ شرک کو شرک نہیں سمجھنے لگتے، بلکہ مشرکانہ رسوم کو عبادت سمجھ کر بڑی عقیدت سے ادا کرتے اور اجر و ثواب کی اُمید بھی رکھتے ہیں۔ اس ظلم و جہل کے نتیجے میں ان کے دل میں شرک سے تائب ہونے، رسومِ قبیحہ کے طوق و سلاسل سے گلو خلاصی پانے، اپنی اِصلاح کرنے اور موحّد بننے کی آرزو نہیں پیدا ہوتی۔ جب آرزو ہی نہ ہو تو دُعا کیسے مستجاب ہو سکتی ہے؟ بقول مولانا حالی

ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو دُعا میں اثر کہاں

یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے کہ مسلم اقوام کی ثقافت نہ تو زندہ و حرکی ہے اور نہ جمیل و جلیل، بلکہ قبیح و مردہ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلم ثقافت کا اپنی روحِ توحید سے قریب قریب رشتہ منقطع ہو چکا ہے اور وہ مشرکانہ رسوم و رواج کی جلوہ گاہ ہے۔

یہ صورتِ حال مسلم اقوام کی بقا و سلامتی اور اس کی دُنیوی و اُخروی زندگی کے لیے زبردست خطرہ ہے اور اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ توحید کی انقلاب انگیز تحریک کے ذریعے معاشرتی سرطانوں اور ان کی پھیلائی ہوئی مشرکانہ رسومِ قبیحہ کا استیصال کر دیا جائے۔

فصل - ۱۱

حرفِ آخر

عقیدۂ توحید انسان کے اندر خون کی طرح رچ بس جاتا ہے اور وہ اس کے مطابق زندگی کرنے لگتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے قلب میں محبتِ الٰہی کی شمع فروزاں ہوجاتی ہے، اس کی تب و تاب سے باطنی نور کا اتمام ہوتا ہے اور انسان کو جمالیاتی ثروت ملتی ہے۔ جمالیاتی ثروت زادِ معاد اور بہائے جنت ہے اور قلب میں طمانیت و مسرت کی جنت بساتی ہے۔

محبتِ الٰہی کے نور سے خواہشاتِ نفسانی کی شمعیں خاموش ہوجاتی ہیں؛ نیز محبتِ الٰہی کی جمالیاتی ٹھنڈک سے دل کو جو خوف و حزن کی آگ لگی ہوتی ہے، وہ ٹھنڈی ہوجاتی ہے۔ علاوہ بریں، نورِ محبتِ الٰہی سے نورِ باطنی بتدریج ترقی کرنے لگتا ہے جسے جمالیاتی ارتقاء سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

قرآنِ مجید کی رو سے ذکرِ الٰہی سے جو عقیدۂ توحید کا ثمرہ ہے، قلب کو اطمینان ایسی نعمتِ عظمیٰ ملتی ہے، جو حاصلِ زندگانی، غایتِ عبادت، مقصودِ دین اور مشیتِ ایزدی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ

تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ○ (الرّعد ۱۳ : ۲۸) : جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور ان کے دلوں کو اللہ کے ذکر سے اطمینان ملتا ہے (وہی حقیقی مومن، اہلِ حسن و سرور اور اصحابِ جنّت ہیں)۔ یاد رکھو! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان و قرار نصیب ہوتا ہے۔

غور کریں تو یہ آیتِ جلیلہ فلسفۂ طمانیت و مسرّت کا مخزن ہے۔ اس میں دو نکات خاص طور سے قابلِ غور اور بصیرت افروز ہیں۔ ایک یہ کہ یادِ الٰہی سے طمانیت و مسرّت ملتی ہے، جسے جالیاتی ثروت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دوسرے، جالیاتی ثروت صرف ذکرِ الٰہی ہی سے ملتی ہے۔ اس کی ضد و نقیض یہ ہوئی کہ جالیاتی ثروت خالص ذکرِ الٰہی کے بغیر نہیں مل سکتی۔ خالص ذکرِ الٰہی خالص عقیدۂ توحید پر دلالت کرتا ہے، یعنی ایسے عقیدے پر جو شرک کی آمیزش سے پاک و منزّہ ہو۔ بالفاظِ دیگر، ذکر ہو تو فقط اللہ تعالیٰ کا اور اس کے ساتھ غیر اللہ کا ذکر کیا جائے نہ اُسے پکارا ہی جائے؛ نیز اللہ تعالیٰ کے سوا نہ تو کسی اور کو اپنا اِلٰہ و ربّ سمجھ یا بنا کر یاد کیا جائے اور نہ اس کا نام وردِ زبان ہی بنایا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ شرک ہے، جس کی آندھی سے محبّتِ الٰہی کی شمع بُجھ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں باطنی نُور کا نہ صرف ارتقا رک جاتا ہے، بلکہ وہ بُجھ جاتا ہے؛ آدمی جالیاتی ثروت سے محروم ہو کر خوف و حزن کا شکار ہو جاتا ہے اور بالآخر اس کی رجعتِ قہقری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اسفل سافلین اور اہلِ نارین جاتا ہے۔ یہ سب سے بڑی محرومی و ناکامی بھی ہے اور سب سے بڑا عذاب بھی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ذکرِ الٰہی اور اطمینانِ قلب لازم و ملزوم ہیں، اسی طرح اطمینانِ قلب اور جنّت لازم و ملزوم ہیں۔ اس کے ثبوت میں مفصّلۂ ذیل آیاتِ جلیلہ پیش کی جاتی ہیں :

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ۝ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ۝ (الفجر ۸۹ : ۲۷ تا ۳۰) : اے مطمئن نفس! اپنے رب کی طرف لوٹ آ۔ تو اُس سے خوش ہے اور وہ تجھ سے خوش ہے۔ پس میرے بندوں میں شامل ہو جا اور داخل ہو جا میری جنّت میں۔

یہ آیاتِ جلیلہ بھی فلسفۂ طمانیت کا گنجینہ ہیں۔ ان کے مضمرات میں سے چند ایک یہ ہیں :

۱۔ نفسِ مطمئنّہ سے مراد وہ مؤمن ہے جس کا دل ذکرِ الٰہی کی بدولت مطمئن ہو اور اسے نہ تو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف ہو اور نہ کوئی غم ہی ہو۔ ایسے مومن کو (مرد ہو یا عورت) صاحبِ حسن و سرور سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

۲۔ صاحبِ حسن و سرور ہی جنّت میں جائے گا، کیونکہ طمانیتِ دل بہائے جنّت ہے۔

۳۔ ذکرِ الٰہی محبّتِ الٰہی پہ دلالت کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان اسی کو یاد کرتا ہے جو اُسے محبوب ہوتا ہے۔ چنانچہ وہی شخص اللہ تعالیٰ کی یاد کو حرزِ جان بناتا ہے، جو اس کو اپنا اِلٰہ (یعنی معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود) سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے سب سے زیادہ یا شدید ترین محبّت کی جائے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ ایمان کا خاصّہ بھی ہے اور تقاضا بھی، جیسا کہ اس ارشادِ الٰہی سے ثابت ہے : وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ (البقرہ ۲ : ۱۶۵)۔ یعنی مؤمن سب سے زیادہ اللہ سے محبّت کرتے ہیں۔

۴۔ ذکرِ الٰہی کا ثمرہ بھی دیکھیے اور مطمئن نفس کی سعادت و خوش نصیبی پر بھی غور کیجئے کہ ایک تو ربِّ ذوالجلال والاکرام پہلے خود اس سے خطاب کرے گا اور کس ذوق و شوق سے اُسے اپنے پاس بلائے گا۔ اس کے الفاظ: "اپنے ربّ"

کی طرف "لوٹ آ" : میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ تو دنیا میں مجھے ہی اپنا رب سمجھتا تھا اور میری طرف ہی رجوع کرتا تھا۔ اس کا صلہ یہ ہے کہ آج تیرا رب تیرا منتظر و میزبان ہے، اس کے حضور آ جا۔ یہ واقعیت با ندازِ دیگر اس طرح بیان ہوئی ہے:

"جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اور پھر وہ اس قول پر جمے رہے (یعنی انہوں نے اللہ کے ساتھ کسی اور کو اپنا ربّ یعنی داتا، حاجت روا، مشکل کشا، کارساز، حافظ و ناصر، ولی و آقا اور مستجیب الدّعوات نہ سمجھا اور نہ پکارا) تو یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں: "نہ ڈرو اور نہ غم ہی کرو، اور خوشی مناؤ اس جنّت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم ہی اس دنیا میں تمہارے اولیاء (= دوست و سرپرست) ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں ہر وہ شے تمہارے لیے ہے، جس کی تم خواہش کرو گے، اور جس چیز کی تم تمنّا کرو گے تمہاری ہو گی۔ یہ سامانِ ضیافت اس ہستی کی طرف سے ہے جو مغفرت کرنے اور بار بار رحم کرنے والا ہے (حمٓ السجدۃ ۴۱: ۳۱ تا ۳۲؛ نیز دیکھیے الاحقاف ۴۶: ۱۳)۔

۵۔ اہلِ تسلیم و رضا سے اللہ تعالیٰ دُنیا اور آخرت دونوں میں خوش ہو گا اور انھیں رضوانِ الٰہی ایسی نعمتِ عظمٰی عطا ہو گی۔

۶۔ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ کو وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ پر مقدّم کرنے میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس کے بندوں کی صحبت و رفاقت، جنّت اور اس کی نعمتوں سے افضل و اولیٰ ہے۔

۷۔ عِبَادِیْ اور جَنَّتِیْ میں یائے متکلّم اللہ تعالیٰ کے بندوں اور اس کی جنّت کی غیر معمولی اہمیت و فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ کے موحّد بندے ہی اس سے سب سے زیادہ محبّت کرتے، اس کو کثرت سے یاد کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہی اہلِ حسُن و سُرور، اہلِ تسلیم و رضا اور اہلِ جنّت ہوتے ہیں ۔

۸۔ طمانیتِ نفس ذکرِ الٰہی کا ثمرہ اور بہائے جنّت بھی ہے، نیز اہلِ جنّت کی پہچان اور کسوٹی بھی ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے اولیآء اللہ کی سلبی انداز میں یہ پہچان بتائی ہے کہ أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (یونس ۱۰ : ۶۲) ؛ سنو! جو اللہ کے دوست ہیں، انہیں خوف ہوتا ہے اور نہ وہ غم ہی کھاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ انہیں دنیا کی زندگی اور آخرت دونوں میں بشارت ہے۔ اللہ کی باتیں غیر مبدّل ہیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے (۱۰ : ۶۴)۔ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے کہ اولیآء اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو نہ خوف ہوتا ہے اور نہ ملال و غم۔ اس مختصر کلامِ الٰہی میں گنجینۂ معانی و حکمت پوشیدہ ہے۔ اس سے یہ تین حقائق منکشف ہوئے : ایک یہ کہ محبّتِ الٰہی کا صلہ خوف و حزن سے نجات ہے۔ دوسرے خوف و حزن سے نجات انسان کی عظیم کامیابی ہے تیسرے، خوف و حزن انسان کے لیے المناک عذاب ہے، اور یہ عذاب حقیقت میں عذاب النّار ہے۔ یہ آگ دل کی آگ ہے، جو لگتی ہے تو پھر بجھتی نہیں، مگر یادِ الٰہی سے یادِ الٰہی کی تاثیر سرُور انگیز ٹھنڈک ہے جو خوف و حزن کی آگ کو ٹھنڈا کر کے دل کو لذّتِ طمانیت سے آشنا کر دیتی ہے۔ ذکرِ الٰہی کی تاثیر سرُور انگیز ٹھنڈک کو قرآنِ حکیم نے قُرَّةُ العین سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ذکرِ الٰہی ثمرہ ہے محبّتِ الٰہی کا، جو اتنی شدید ہو کہ سب چیزوں کی محبّت پہ غالب آ جائے اور اس کی بدولت انسان صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا اِلٰہ یا معبود و محبوب اور مطلوب و مقصود اور ربّ بنائے اور اس کا بندہ بن کر زندگی کرے۔ یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خوف و حزن

کی آگ میں دھواں بہت ہوتا ہے ، لہٰذا اسے "آتشِ دُخانی" سے موسوم کرسکتے ہیں۔

خوف و حزن کی آتشِ دُخانی سے قلب کو طرح طرح کی اذیّت ناک بیماریاں لگ جاتی ہیں، جو زندگی کو اجیرن بنا دیتی ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں :
اندیشہ ہائے گوناگوں، جو حقیقی بھی ہوتے ہیں اور ظنّی و خیالی بھی ؛ مثلاً جان و مال کے نقصان اور عزّت و ناموس کے لُٹ جانے کا خطرہ ۔ ڈراؤنے خواب دیکھنا ؛ اضطراب و بیقراری ؛ آشفتہ سری و دیوانگی، احساسِ محرومی و تنہائی ؛ خواہشِ جرم و مرگ؛ بیزاری و آوارگی؛ ظلم و جہل ؛ غیظ و غضب، شرک و بت پرستی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں)؛ اذیت پسندی و مردم بیزاری و آزاری ؛ بخل و بزدلی، بے بصری و بے سمعی، قساوت و شقاوت؛ حسن کوری و کور ذوقی وغیرہ وغیرہ ۔ ان بیماریوں سے قلب کو آتشِ دُخانی لگ جاتی ہے، جس میں آگ کی جلن بھی ہوتی ہے اور ناک میں دم کر دینے والا دھواں بھی ۔ اس آتشِ دُخانی سے نجات حاصل کرنے کی خاطر بعض لوگ خودکشی کر لیتے ہیں اور اکثر مُسکّن و خواب آور ادویہ اور منشیات کے عادی ہو جاتے ہیں، اس لیے نشہ آور ادویّہ کا استعمال بھی خطرناک حد تک بڑھ رہا ہے ۔ ان میں بعض ادویّہ مہلک ہوتی ہیں، مثلاً ہیروئن وغیرہ ۔

قرآنِ حکیم نے چودہ سو برس پہلے انسان کو خوف و حزن کی بیماریوں سے متنبہ کیا تھا اور انھیں اہلِ نار کی علامت بتایا تھا اور ساتھ ہی ان کے اسباب اور علاج بھی بتا دیا تھا ۔ ان بیماریوں کا ایک بنیادی سبب "خدا فراموشی" ہے، جس کے نتیجے میں انسان کافر و منافق، مشرک و بت پرست، ظالم و جاہل، متکبّر و خود فراموش اور گناہگار و مجرم بن جاتا ہے ، نیز وہ قدرت کے قانونِ مکافاتِ عمل، یوم الدّین اور جہنم کے عذاب النّار سے بے خوف ہو جاتا ہے ۔ اس کی یہ بے خوفی اسے خوف و حزن کی آتش ناک بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے، جن کا علاج قرآنِ مجید نے "ذکرِ الٰہی"

بتایا ہے۔ اس کی ایک اہم ترین تشریح اس نے یہ کی ہے کہ "جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب کہتے ہیں اور پھر اپنی اس بات پر جمے رہتے ہیں، وہ خوف و حزن (کی آگ) سے محفوظ رہتے ہیں (الاحقاف ۴۶: ۱۳-۱۴)، بلکہ وہ مطمئن و خوش بھی ہو جاتے ہیں (۴۶: ۱۴)۔ سائنس نے اس سلسلے میں چودہ صدیاں بعد قرآنِ مجید کی تصدیق کی ہے اور علمائے نفسیات نے تحقیق و تفتیش اور مشاہدات و تجربات کے بعد خوف و حزن کی بہت سی بیماریوں کا سراغ لگایا ہے اور ان کی مضرت رسانی و جنون انگیزی اور اذیت تا کی و ہلاکت آفرینی کو دریافت کیا ہے۔ انھوں نے یہ حقیقت تو تسلیم کر لی ہے کہ یہ بیماریاں نوع انسانی کے لیے انتہائی خطرناک ہیں اور اس کا علاج ضروری ہے اور اس کے مختلف علاج بھی تجویز کیے ہیں، جو سیکولر نوعیت کے ہیں لیکن انھوں نے قرآنِ مجید کے تجویز کردہ علاج کی طرف ابھی تک توجہ نہیں دی۔ اس کی ایک بنیادی وجہ غیر مسلم ماہرینِ نفسیات کی اسلام دشمنی اور قرآنِ مجید سے نا آشنائی ہے اور مسلم ماہرینِ نفسیات کی قرآنِ مجید سے دوری و مہجوری اور غیر مسلم ماہرینِ نفسیات کی کورانہ تقلید ہے، علاوہ بریں، قرآنی طریقۂ علاج قبول کرنے سے ان کو قرآنِ مجید کے عقیدۂ توحید کی تائید و تصدیق اور مشرکوں، کافروں اور بت پرستوں کے عقائد کی تردید و تکذیب کرنا پڑتی ہے۔ باوجود اس امر کے چونکہ خوف و حزن کی بیماریوں کا علاج صرف عقیدۂ توحید کو دل و جان سے تسلیم کرنے اور اس کے مطابق زندگی کرنے ہی سے ہو سکتا ہے اور اس کا کوئی متبادل طریقِ علاج نہیں ہے، لہٰذا انہیں قرآنِ مجید کے تجویز کردہ نسخۂ شفا کو زود بدیر قبول کرنا ہی پڑے گا۔ یہ شدنی ہے، کیونکہ قرآنِ مجید کا دعویٰ یقیناً سچا ہے کہ اسلام کا دینِ توحید جملہ ادیان یعنی عقائد و افکار اور مذاہب و طریقِ زندگی پر غالب آ کر رہے گا، چاہے مشرکوں پر ناگوار ہی کیوں نہ گذرے (الصف ۶۱: ۹)۔

چونکہ موحّد کو غیر اللہ (مثلاً معبودانِ باطلہ، جیسے دیوتاؤں، دیویوں، حقیقی یا

خیالی زندہ و مردہ بزرگوں، مظاہرِ فطرت وغیرہ وغیرہ، نیز فرعونی و ہامانی، قارونی و آذری اور اشتمالی و اشتراکی سرطانوں) کا نہ تو خوف ہوتا ہے اور نہ دُنیوی نعمتوں کے ضیاع وزیاں کا غم، نیز وہ متوکل و قناعت پسند اور اہلِ تسلیم و رضا ہوتا ہے، اس لیے مجاہد و آزاد ہوتا ہے اور اُسے غیر اللہ کی محکومی و بندگی منظور نہیں ہوتی، برخلاف اس کے شرک میں غیر اللہ کا خوف مضمر ہوتا ہے، اس لیے وہ غیر اللہ کی بندگی اور حمد و ثنا کرتا، نیز اس کے سامنے سرنگون و سربسجود ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ خوگرِ محکومی و غلامی اور خدا ناشناس و خود ناشناس بن جاتا ہے۔

ان مباحث کا ماحصل یہ نکلا کہ توحید ہی اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین اسلام کی روح، انسان کی دُنیوی و اُخروی حسنہ، اس کے مادّی و جمالیاتی ارتقاء، نیز ربِّ ذوالجلال والاکرام کی رحمت و مغفرت اور قرب و رضوان کی ضامن ہے۔ علاوہ ازیں اُسے خود آگاہ و خدا آگاہ، ولی اللہ، صاحبِ حُسن و سُرور، اہلِ تسلیم و رضا اور اہلِ جنّت بناتی ہے۔ بخلاف اس کے شرک جو توحید کی ضد و نقیض ہے، ناقابلِ معافی گناہِ کبیرہ ہے؛ اور یہ مشرک کو ظالم و جاہل، خدا ناشناس و خود ناشناس، گناہگار و زیاں کار، جمالیاتی ثروت سے محروم اور لذّتِ زندگی سے نا آشنا، نیز اسے معاشرتی سرطان، اسفل سافلین اور اہلِ نار بنا دیتا ہے۔

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور۔ باہتمام عبدالسّلام پرنٹر اور پبلشر

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کی
شہرۂ آفاق تصانیف

- پیغمبرِ اعظم و آخر
- رُوداد سفرِ حجاز
- اسلامی ثقافت
- حُسنِ انقلاب
- آرزوئے حُسن
- کتابِ زندگی
- طرب و کرب
- فلسفۂ توحید
- فلسفۂ رسالت

فیروز سنز لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی